بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ سفر

محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ قاسمی

ناشر
مکتبہ نعیمہ

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	تقریظ	۳
۲	پیشِ لفظ	۴
۳	حج کا سفر	۵
۴	چوتھا عمرہ	۱۸
۵	سفر طابہ	۱۹
۶	دارالعلوم کنتھاریہ میں اساتذہ سے ملاقات	۲۳
۷	ایک سفر: ڈوڈھ، بھدرواہ، گل ڈنڈی (جموں وکشمیر)	۲۵
۸	ہنگامی سفر	۳۲
۹	دہرادون میں دو دن	۳۷
۱۰	وطن اصلی کی طرف	۴۱
۱۱	بجنور اور دہلی	۴۴
۱۲	مختصر پرلطف سفر	۴۸
۱۳	ڈابھیل کا سفر اور دعوت طعام	۵۱
۱۴	ایک سفر میں اساتذۂ جامعہ سے ملاقات	۵۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقریظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحبِہٖ أَجْمَعِیْنَ.

یوں تو انسان کی حیات پوری کی پوری ایک سفر ہے جس کی منزل آخرت ہے۔ لیکن اس میں بھی بہت سے اسفار ایسے ہوتے ہیں جن سے ہمیں قدرتی طور پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور ان سے خوشگوار یادیں وابستہ ہو جاتی ہیں، جبکہ کچھ اسفار ایسے بھی ہوتے ہیں جو غم، تکلیف اور مشکل کا باعث ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے بہت سے گہرے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ اور بعض اسفار ایسے ہوتے ہیں جن سے خوشی حاصل ہوتی ہے نہ غم، بس سفر تھا گزر گیا۔۔۔

"نقش سفر" اس کتاب میں بھی مؤلف صاحب جناب مفتی محمد یحییٰ بن عبد الحفیظ انوری و قاسمی نے اپنی زندگی کے ایسے ہی بہت سے اسفار کو جمع کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنے کی اور منظر کشی کرنے کی خوب صلاحیت عطا کی ہے جیسے کہ حرمین شریفین کی زیارت بقصد حج فرض میں، مکہ مکرمہ ہو یا مدینہ منورہ یا عرفات و منیٰ کی وادیاں ہو آپ محسوس کریں گے گویا کہ آپ خود ان گلی کوچوں کی سیر کر رہے ہوں، یا پھر کشمیر کی وادیاں ہوں اساتذہ سے ملاقات ہوں یا دوستوں کی بے تکلف محفل دعوت ہو۔ ہر جگہ آپ ان کی حسن کتابت و شاندار یادداشت کا مشاہدہ کریں گے اور دلکش منظر کشی سے محظوظ ہوں گے۔

ہمارے مؤلف صاحب چونکہ شاعر بھی ہیں لھذا دوستوں کی محفل میں پر لطف اشعار سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔ جہاں خود روئے ہیں آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو لائیں گے اور جہاں خود مسکرائے ہیں وہاں آپ کے چہروں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف صاحب دامت برکاتہم کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور تمام مومن و مومنات کا آخری سفر پر حسن خاتمہ فرمائے آمین یا رب العالمین

یکے از بندۂ خدا

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ.

انسان کی زندگی ایک مسلسل سفر ہے—کبھی دل کے راستوں پر، کبھی زمین کے خطوں پر۔ قدم جہاں پڑتے ہیں، وہاں تجربات کے نقوش بنتے ہیں، اور نگاہ جہاں ٹھہرتی ہے، وہاں یادوں کا چراغ جل اٹھتا ہے۔ انہی منازلِ زیست کے مشاہدات کو قلم کے قالب میں ڈھال دینا گویا اپنی زندگی کے صفحوں کو ابدی کتاب بنا دینا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ انہی روشن صفحات کا حاصل ہے—مصنف کے دل و دماغ، روح و احساس اور مشاہدہ و تجربہ کا حسین امتزاج۔ اس میں حج و عمرے کے روحانی سفر کی کیف آور داستان بھی ہے، جہاں دل حرمین شریفین کی فضاؤں میں جھومتا ہے اور روح تقدیس و بندگی سے لبریز ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہندوستان کے مختلف خطوں—کشمیر کی وادیوں سے لے کر بجنور کے علمی ماحول تک، اور گجرات کے ممتاز مدارس، ڈابھیل و کنتھاریہ—تک کے اسفار کی روداد بھی شامل ہے۔ ان سب میں مشاہدہ کی گہرائی، احساس کی گرمی اور تحریر کی سادگی و صداقت جھلکتی ہے۔

یہ سفرنامے محض مناظر کا بیان نہیں، بلکہ ایک متلاشی دل کی داستان ہیں جو علم، روحانیت اور تعلقِ وطن، سب کو ایک رشتے میں پرو دیتے ہیں۔ قاری جہاں مناظر دیکھتا ہے، وہاں محسوس بھی کرتا ہے؛ جہاں الفاظ پڑھتا ہے، وہاں مصنف کے ساتھ چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ یہ مجموعہ قارئین کے لیے نہ صرف دلچسپی اور معلومات کا سامان بنے، بلکہ روح کی بالیدگی اور ایمان کی تازگی کا ذریعہ بھی ہو۔

اللہ تعالیٰ مصنف کے اس خلوصِ نیت سے لکھی گئی محنت کو قبول فرمائے اور اسے نافع و مقبول بنائے۔ آمین۔

الفقير الى رحمة ربه

ابو عبداللہ محمد یحیی بن عبد الحفیظ انوری قاسمی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ.

حج کا سفر

مدرسہ میں چوں کہ بہت سے اعمال اور اعمال کے درمیان درجہ بندی، اسی طرح حکموں کی تعیین و ترتیب سکھلائی جاتی ہے، ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اسی ترتیب و تفصیل کے مطابق عمل بھی ہو۔ لہٰذا جب مشکاۃ شریف میں نکاح کے احکام کی تفصیل پڑھی تو اس کے بعد آنے والی جمعرات کو اپنے شیخ سے مشورہ کر کے گھر پہ بات رکھ دی کہ میرے لیے لڑکی تلاش کرو اور بات کچھ اس طرح رکھی کہ دوسرے دن ہی مجھے ایک لڑکی دکھانے لے گئے تھے، جو بہت پسند آئی لیکن مقدر نہیں تھا۔ بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ نکاح کرنا بسا اوقات فرض عین ہوجاتا ہے اور سند فضیلت حاصل کرنا یا اس کے آگے کی پڑھائی کا یہ حکم نہیں ہے۔ اس لیے میری ترجیح کا رخ بدل گیا تھا۔

جب میں پڑھ کر ۲۰۱۱ء میں فارغ ہوا تو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ حج مجھ پر فرض ہے۔ اس لیے اب تمام کاموں سے پہلے جلد از جلد اس فریضہ کی تکمیل کرنا چاہیے۔ نقد پیسے تو میرے پاس تھے نہیں البتہ امی کا دیا ہوا ۱۸۱، ۲۰ر تولہ سونا موجود تھا۔ فارغ ہونے کے بعد والے رمضان کا آخری عشرہ ڈابھیل خانقاہ میں بحالت اعتکاف گزارا اور یہاں ہر دعا میں حج کے لیے دعا کرتا بالخصوص جمعہ کی عصر سے مغرب تک یہی ایک دعا کا تکرار کرتا۔ رمضان بعد گھر گیا تو بظاہر حج پر جانے کے نہ اسباب تھے نہ آثار اور نہ ہی انسانوں میں کوئی مددگار لیکن پروردگار کے حضور دعا کارگر ہوگئی تھی تو اب چاہے کوئی طلب گار نہ ہو اور نہ ہی ہو پرسان حال، فیصلہ رب درگزار کے وہاں ہو چکا تھا۔

دل نے پختہ عزم کرلیا کہ سونا بیچنا ہے، حالاں کہ ہمارے بھائیوں میں سے سونا کسی نے ابھی تک نہیں بیچا اور نہ ہی ابا نے کبھی بیچا تھا اور سونا میری ملکیت میں آئے ہوئے تین سال کا ہی عرصہ ہوا تھا یہ ایک نیا کام بظاہر جواب دہ اور دشوار کام تھا۔ اللہ کا احسان ہوا کہ شفانے تو

ایک دم اجازت دے دی، جس کی ملکیت میں وہ بعد میں رہنے والا تھا۔ امی کو بھی میں نے کسی طرح راضی کرلیا اور باقی کے راضی نہ ہونے کی مجھ کو کوئی گرانی نہ تھی۔ ویسے امی کی یہ خاص بات ہے کہ جب انھیں یہ کہا جاتا ہے کہ امی شریعت کا یہی حکم ہے تو وہ کام چاہے روایات کے کتنے ہی خلاف کیوں نہ ہو رفتہ رفتہ امی رام ہو ہی جاتی ہیں۔

سونا لے کر میں نے کئی سونار کی دکانوں کی گردش کی لیکن اچھے دام نہیں مل رہے تھے حتی کہ میں کرلا توحید جویلرس بھی گیا جس کے متعلق یہ مشہور کیا گیا تھا کہ وہ خریدتے وقت پیسے نہیں کاٹتا ہے لیکن جانے پر معلوم ہوا کہ اسی سونے سے متعلق ہے جو اس کے پاس سے خریدا جائے۔ بہر حال جب میں پریشان ہوگیا تو امی نے کہا کہ سونا بیچنے کے بجائے میرے پاس رکھوادے جب کبھی مجھے پیسے لوٹادے گا تو سونا لے جانا۔ میرے لیے اس سے اچھی بات اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کیا ہوسکتی تھی۔ میں نے سونا رکھ کر امی سے ڈھائی لاکھ روپے لیے اور ''لمراس'' نامی ایک غیر مشہور ٹور والے کے پاس الطاف کے ساتھ جاکر جمع کر آیا۔

قصہ مختصر ۲۰۱۲ء ستمبر کے مہینے میں، میں احرام پہن کر ایئر پورٹ پر تھا۔ کم عمر میں ہمارے یہاں (وہ بھی تنہا) حج کے لیے جانے کا رواج نہ تھا اور چوں کہ میں پہلے ہی سے رواج شکن واقع ہوا ہوں یہاں بھی میں لوگوں کی چہ می گوئیوں سے گزر کر ہوائی جہاز میں تلبیہ پڑھ کر محرم ہونے کی خوشیاں اپنی آنکھوں میں سجائے زور زور سے تلبیہ پڑھ رہا تھا لبیک لبیک کی صدائیں سن کر مست ہو رہا تھا۔

ہوائی جہاز حاجیوں سے ہی بھرا تھا۔ ہر مرد نے دو سفید چادر لپیٹ رکھی تھیں۔ کوئی اپنی بیوی کے ساتھ تھا، کوئی اپنے بیٹے کے ساتھ اور کوئی دوست و احباب کے حلقہ میں تھا۔ میں ہی ایک تنہا تھا۔ اس وجہ سے بعض لوگ مجھے ٹور والا سمجھ رہے تھے۔ اکثر لوگوں کا پہلی ہی مرتبہ حج کا سفر تھا۔ سب ایک دوسرے سے بات کرنے میں اور سیکھنے سکھانے میں مشغول تھے۔ میں تنہا تھا لیکن میری تنہائی نے اللہ کا شکر ہے مجھے کبھی پریشان نہیں کیا اس زمانے میں اینڈرویڈ موبائل نہیں تھا اور نہ چھوٹے موبائل میں گیم کھیلنے کی عادت تھی، نہ کاغذ قلم تھا کہ احوال رقم کروں۔ کتابیں تھیں لیکن حج کے سفر کی خوشی نے اور بیت اللہ شریف کی زیارت کی دیوانگی نے کتابوں سے بے گانہ بنا رکھا تھا، البتہ میں نے کچھ مناجات اور بیت اللہ کی حاضری کے وقت پڑھی جانے

والے منظوم کلام کو اسی طرح روضہ اقدس پر حاضری کے وقت کے اشعار اور نعت شریف لکھ کر اپنے پاس رکھ لی تھیں بالخصوص حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہم کے وہ اشعار جو جنید جمشید مرحوم نے پڑھے تھے۔تلبیہ کے ساتھ ساتھ وہ اشعار بھی گنگناتا۔

شام کے بعد ممبئی سے اُڑے تھے۔ رات کے کسی وقت جدہ پہنچے۔ اپنا سامان لے کر طویل انتظار کے بعد بس سوار ہوئے۔ ممبئی سے نکلتے وقت شہناز آپا نے روح افزا کی بوتل بیگ میں رکھ دی تھی جو لیکیج میں دب کر پھوٹ گئی تھی اور سارا بیگ اور بیگ میں رکھے کپڑے روح افزا میں معطر ہو چکے تھے۔ میرے ہاتھوں پر بھی روح افزا لگ گیا تھا جس کی تلافی صدقہ سے کی گئی۔

میں نے فجر کی نماز ادا کی بعد ازاں کچھ لمحوں میں ہم مکہ مکرمہ (شَرَّفَهَا اللهُ وَكَرَّمَهَا) کی حدود میں تھے۔ بڑے رحال نما بریج کے نیچے سے ہماری بس گزر رہی تھی۔ ہم نے دعا پڑھی اور مزید دعا مانگی اَللّٰهُمَّ إِنَّ هَذَا حَرَمُكَ وَحَرَمُ رَسُولِكَ، فَحَرِّمْ لَحْمِي وَدَمِي وَعَظْمِي عَلَى النَّارِ اَللّٰهُمَّ مِنِّي مِنْ عَذَابِكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ، وَاجْعَلْنِي مِنْ أَوْلِيَائِكَ وَأَهْلِ طَاعَتِكَ، وَتُبْ عَلَيَّ،إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ.

بس مکہ مکرمہ میں مسفلہ جا کر رکی اور ایک عام سے ہوٹل میں بڑے سے کمرے میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ میرے لیے تو یہی کافی تھا کہ پلنگ پر چادر اور کمرے میں اے سی تھا۔ باقی لوگ جنھوں نے لمبی امیدیں باندھ رکھی تھیں جہاز سے اترنے کے بعد سے اب تک بلکہ واپسی تک شکوہ شکایت کا دہانہ کھولے ہوئے تھے۔ واقعۃً پیسوں اور وعدوں کے مطابق سہولتیں بہت کم تھیں۔ کھانا لائن لگا کر اپنے کمرہ میں کھانا ہوتا۔ دیگر ٹورس کی طرح کھانوں میں تنوع اور اقسام نہیں تھے۔جن ڈرائے ، روغن ، سیخ و بریاں کی امیدیں لوگوں نے باندھ رکھی تھیں وہ ہر صبح و شام ٹوٹ رہی تھیں۔ کھانا بانٹنے والا بھی تندخو ، کالا ڈیل ڈول سے ہندی تھا، کھانا بانٹتے وقت اپنا بدبودار پسینہ کھانے کے برتن میں گراتا اور انڈیا سے لائے ہوئے پان مسالوں اور گٹکوں سے منہ کو پاخانہ بنائے رکھتا، بہر حال حالات سے سمجھوتا کر کے لوگ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنا سفر حج برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے پڑھا تھا کہ ہوٹل میں اپنا سامان رکھ کر آرام کر لینا چاہیے پھر عمرہ کی ادائیگی کرنا چاہیے تا کہ ہم عمرہ اطمینان سے کر سکیں۔تھکن جلد بازی کرنے پر مجبور نہ کرے لیکن نیند کس کو

آرہی تھی۔ تھکا دینے والے سفر اور اے سی میں چادر اوڑھے لیٹے رہنے کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بالآخر میں احرام کی چادروں میں نیچے اترا۔ استقبالیہ سے ہوٹل کا کارڈ لیا تا کہ واپسی میں دشواری نہ ہو۔ مسفلہ سے حرم شریف پاپیادہ تقریباً ۳۵ر سے ۴۰ر منٹ کے فاصلے پر تھا اور آنے جانے کے لیے کسی بس یا سواری کا انتظام نہیں تھا۔ وہاں سے حرم شریف کا راستہ یوں آسان تھا کہ سب اسی طرف جاتے ہوتے ہیں لیکن دشواری یوں ہے کہ حرم شریف تک چڑھائی ہے واپسی آسان ہے کہ ڈھلان ہے اور اس لیے مشکل ہے کہ عام طور پر لوگ راستہ بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ واپسی میں میں نے کتنے ایسے ضعیف و جواں، مرد و عورت کو دیکھا جو اپنے ہوٹل کا راستہ بلکہ بعض نام تک بھول چکے تھے اور انھوں نے استقبالیہ سے ہوٹل کا کارڈ بھی نہیں لیا تھا۔

میں نے پڑھا تھا کہ جب بیت اللہ شریف کے ارادے سے ہوٹل سے نکلیں تو نیچے دیکھ کر بیت اللہ شریف جائیں۔ راستہ میں آنے والی عالیشان عمارتوں اور خوشبودار پکوان کی طرف نظر نہ اٹھائیں اور میں تو اکیلا تھا۔ تنہا اس طرح جانا دشوار تھا کہ راستہ معلوم نہ ہو نیچے دیکھ کر چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی یہ ہوئی کہ مدھیہ پردیش کے ایک تنہا ساتھی مجھے مل گئے۔ ہم طاق طاق مل کر جفت ہو گئے۔ لہٰذا ہم دونوں حرم شریف کی طرف بڑھے وہ آگے آگے تھے اور میں کرتا پکڑ کر پیچھے پیچھے۔ وہ راستہ دیکھ دیکھ کر، پوچھ پوچھ کر آگے بڑھ رہے تھے اور میں نظریں جھکائے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب کی یہ دو نظمیں پڑھتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

(۱) الٰہی تیری چوکھٹ پر بھکاری بن کر آیا ہوں
سراپا فقر ہوں اور عجز و ندامت ساتھ لایا ہو

(۲) در بار میں حاضر ہے اک بندۂ آوارہ
آج اپنی خطاؤں کا لادے ہوئے پشتارہ

ویسے زیادہ رونا نہیں آتا اور لوگوں کی موجودگی میں تو مزید آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں لیکن یہ دو نظمیں پڑھتے وقت اور مسجد حرام کے قریب ہوتے ہوتے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ ساتھی مصاحب بھی حالت سمجھ گیا تھا اس لیے وہ بھی باتیں کرنے سے باز تھا۔ آخر کار باب ملک عبد العزیز سے اندر داخل ہوئے۔ یہاں سے داخل ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ اندر داخل ہونے کے کچھ دیر بعد کعبہ شریف نظر آجاتا تھا اور دوسرا وہاں سے حجر اسود قریب تھا۔

جہاں سے طواف شروع کیا جاتا ہے۔

باب ملک عبدالعزیز سے داخل ہوکر ہم کچھ دور چلے پھر جب یہ احساس ہوا کہ بیت اللہ شریف نظر آرہا ہے تو ہم ایک طرف ہوگئے اور خوب اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیں اور یہ دعا پڑھی بِسْمِ اللهِ، اللهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ تَشْرِيفًا وَتَعْظِيمًا وَتَكْرِيمًا وَبِرًّا وَمَهَابَةً.

وہ منظر بھی میرے لیے بڑا عجیب تھا اور کسی کرشمہ سے کم نہیں تھا کہ میں اپنے سر کی آنکھوں سے پرعظمت، وقیع، صدا بہار، مربع عمارت کو دیکھ رہا ہوں (جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرکے لوگوں کے وجود کے لیے اقوام اور لوگوں کی عبادت کے لیے قبلہ نما بنایا ہے تا کہ لوگوں میں اتحاد اور شیرازہ بندی رہے۔) ہزاروں لوگ اس کا طواف کر رہے ہیں۔ کوئی حجر اسود کا استقبال کر رہا ہے تو کوئی ملتزم سے چمٹا ہوا ہے، کوئی حطیم میں گھسا ہوا ہے تو کوئی حجر اسود کی تقبیل کے لیے قطار میں ہے، کوئی زمزم کے کولروں کے پاس ہے تو کوئی مقام ابراہیم کے پیچھے دوگانہ طواف ادا کر رہا ہے، کوئی رمل کر رہا ہے تو کوئی ہاتھ اٹھائے زار و قطار رو رہا ہے، ایک عظیم الشان کعبہ کا منظر نظر آرہا تھا۔ چمچماتی دھوپ میں غلاف کعبہ کی سونے اور چاندی کی گلکاریاں بھی چمک رہی تھیں۔ پتا نہیں اس عمارت میں ایسا کیا تھا کہ لوگوں کی نظریں اس سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

کعبہ شریف کے صحن میں اتر کر ہم نے حجر اسود کا استقبال کیا اور کعبہ شریف سے قدرے فاصلے پر جہاں رش کم تھا طواف شروع کیا۔ دوران طواف دعائیں مانگتا رہا۔ حجر اسود کی تقبیل کرنے کی اور طواف کے بعد ملتزم یا حطیم جانے کی ہمت نہیں تھی، اژدہام اتنا تھا کہ بغیر کسی کو تکلیف پہنچائے یہ عمل نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے نہ کرنے کو ہی ترجیح دی۔ البتہ حج کے بعد کسی وقت ملتزم پر پہنچنے کی کوشش کی تو اتنا رونا آیا کہ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ چوں کہ وہاں سب ہی رو رہے تھے، سب کے دل نرم تھے اس وجہ سے سیدھا دل پر اثر ہوا۔ ایک مرتبہ اور ایسا ہوا تھا کہ جب میں فارغ ہوا اور سند فراغت حاصل کرنے کے بعد جب طلباء آپس میں ملے (تو ہر سال طلباء روتے تھے اور مجھے ان کے رونے پر تعجب تھا اور میں اپنے تئیں یہ سوچتا تھا کہ مجھے رونا نہیں آئے گا) لیکن جب میں چند طلبا سے گلے ملا سب ہی رو رہے تھے تو مجھے

بھی بے اختیار رونا آیا اور خوب زار و قطار رویا۔ یہی حال ملتزم کے پاس موجود بعض قلوب کا ہے وہ اتنے نرم اور اثر انداز ہوتے ہیں کہ ان کا اثر پاس والے قلب پر بھی پڑتا ہے۔ بہر حال یہ ملتزم پر جانے کی کوشش تھی لیکن جا نہیں سکا۔

طواف کے بعد ساتھی مصاحب گم ہو چکے تھے۔ میں تنہا مسعی کی طرف گیا۔ صفا مروہ کی سعی کر کے حلق کروایا اور حلال ہو گیا۔ اب واپسی میں اسی کارڈ کی وجہ سے پوچھتے پوچھتے اپنے مستقر پہنچا اور کھا پی کر آرام کیا۔ ہوٹل حرم شریف سے کافی فاصلے پر تھا اس لیے تمام نمازیں حرم شریف میں نہیں ادا کر سکتا تھا۔ زیادہ وقت حرم شریف میں گزرے اس کے لیے میں نے یہ ترتیب بنائی کے ظہر بعد کھانا کھا کر پیدل حرم شریف چلا جاتا اور فجر پڑھ کر وہاں سے آتا اگر کبھی بھوک کی شدت ہوتی تو عشا بعد کھانے آجاتا پھر چلا جاتا اور فجر بعد سے ظہر تک سوتا رہتا۔

مکہ مکرمہ کے اس قیام کے دوران مجھے بواسیر بھی ہو گیا تھا اور یہ بڑی تکلیف دہ حد تک بڑھ گئی تھی بڑے استنجا کے بعد آدھے گھنٹے تک پلنگ پر لیٹا رہتا تب جا کر درد کی تکلیف کچھ کم ہوتی۔ بواسیر کی یہ تکلیف مدینہ منورہ تک رہی اور کافی سالوں سے میں اس بیماری میں مبتلا تھا۔ مکہ مکرمہ کے آخری پندرہ دنوں میں مجھے مولوی عمران کے والد صاحب ملے جو شوگر کی وجہ سے پیروں سے معذور ہو گئے تھے۔ خالہ جان (اپنی اہلیہ) کے ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہمارے ہوٹل سے کافی دور ان کا قیام تھا۔ میں برابر ان کے پاس جاتا، تھوڑی بہت خدمت کرتا، وہیل چیئر پر طواف عمرہ کراتا (جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھ سے تھوڑی بہت خدمت لی۔) ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ”مولوی یحییٰ کچھ مانگنا ہے تو مانگ لو۔ میں آپ کے لیے دعا کر دوں گا“ میں اس وقت بواسیر کی بیماری سے جوجھ رہا تھا میں نے کہا کہ حضرت بواسیر سے پریشان ہوں دعا کریں بواسیر ختم ہو جائے۔ اس وقت کا دن ہے اور آج کا دن ہے تقریباً ۱۲ سال ہو گئے مجھے بواسیر نے پریشان نہیں کیا۔ چاہے کتنی ہی گرم غذا کیوں نہ کھالوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ.

صاحب ٹور بڑے لمبے چوڑے وعدے کر کے لایا تھا لیکن کارکردگی میں وہ صفر ثابت ہوا تھا۔ گروپ والوں نے جمع ہو کر اس کے ناک میں دم کر دیا تو اس نے حج کے بعد اجیاد روڈ پر حرم شریف سے ۵۰۰ میٹر دور "فندق التقوی" میں ہمیں منتقل کیا۔ اب تمام نمازیں حرم شریف میں پڑھنا آسان ہو گیا لیکن رات میں حرم شریف کا قیام ترک ہو گیا۔ یہاں سے میں کبھی

مسجد عائشہ سے عمرہ کرتا، کبھی جعرانہ سے، جعرانہ سے ایک ہی مرتبہ ہوا۔

فندق التقوی میں ہفتہ، دس دن رہنے کے بعد دوبارہ مسفلہ منتقل کیا گیا اور کچھ دنوں کے بعد وہاں سے مدینہ منورہ بذریعہ بس روانگی ہوئی۔

ہندوستان سے جانے والے اکثر حاجی حج تمتع کرتے ہیں اور یہ بنسبت افراد و قران کے آسان تر ہے یعنی تمتع میں اولاً عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے پھر ایام حج میں دوبارہ احرام حج کی نیت کی جاتی ہے۔ میں نے بھی تمتع کی نیت کر رکھی تھی اور عمرہ سے فارغ ہو کر عبادتوں میں لگا ہوا تھا۔ جیسے جیسے حج کے ایام قریب آرہے تھے جوشِ عبادت فزوں تر ہو رہا تھا بالآخر سات ذی القعدہ کی شام ٹور والے نے اعلان کیا کہ آج رات ہم منٰی کے لیے روانہ ہوں گے۔ ویسے سنت تو یہ ہے کہ آٹھ ذی الحجہ (یوم الترویہ) کی صبح منی کے لیے نکلے اور ظہر سے فجر پانچ نمازیں منی میں ادا کرے لیکن ٹور والے انتظامی پریشانیوں سے بچنے کے لیے یہاں بھی سنت کے خلاف رات ہی میں منی کے لیے جاتے ہیں اور منٰی سے عرفات بھی رات ہی میں لے جاتے ہیں حالاں کہ سنت ۹/ذی الحجہ کی فجر پڑھ کر عرفات جانا ہے۔

بہر حال ہم رات گئے۔منی (خیموں کا شہر) اپنے خیمہ میں پہنچ گئے۔منی میں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے بہت سے خیمے مزدلفہ میں لگائے گئے تھے یہیں مزدلفہ میں ہمارا بھی خیمہ تھا۔ جب کہ حج کمیٹی سے آئے ہوئے حاجی اسی طرح مہنگے ٹور والوں نے اپنی جائے قرار منی ہی میں رکھی تھی۔منی میں عام سا ہمارا خیمہ تھا اور کئی خیموں کا مشترکہ بیت الخلا اور غسل خانہ تھا جس کے باہر عموماً لائن لگی ہوتی۔

منٰی خیموں کا شہر ہے اور تمام خیمے ایک ہی طرز کے ہیں اور اس کی گلیاں بھول بھلیاں ہیں۔ اسی لیے معلم اور ٹور والوں کی طرف سے ہدایت ہوتی ہے کہ اپنے خیموں سے دور نہ جائیں ورنہ حج کے ایام کے بعد ہی ملاقات ہو گی۔منیٰ میں مسجد خیف بھی تھی لیکن ہمارے جائے قیام سے کافی دور اور مجھے وہاں جاکر نماز ادا کرنا تھا۔ساتھیوں کو بتائے بغیر عصر بعد مسجد خیف کی طرف نکل کھڑا ہوا اور اپنے ساتھ ایک کاغذ لے لیا جب جب کسی موڑ سے گزرتا تو شارع کا نام، منطقہ نمبر اور خیمہ نمبر لکھ لیتا تا کہ واپسی ممکن ہو۔ کئی موڑ سے گزرنے کے بعد بالآخر مسجد خیف پہنچ گیا۔ بڑی تابناک اور وسیع مسجد تھی۔مسجد میں تمام جگہ لوگوں نے قیام کر رکھا تھا۔مغرب

پڑھ کر وہاں سے نکلا اور اپنے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق جانے لگا کچھ دور چلنے کے بعد ایک روڑ جس سے گزر کر میں آیا تھا وہ پولس والوں نے بند کر دیا تھا اور میں اسی راستے سے پہنچ سکتا تھا۔ میں نے پولس والے سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات کر کے اپنی پریشانی سمجھائی تو اس نے مجھے جانے دیا اس طرح اس نقشے کی مدد سے میں بعافیت اپنے خیمے میں پہنچ گیا۔ اگر پولس والا نہ جانے دیتا تو میں اپنے حج کے ساتھیوں سے ۱۳/ذی الحجہ ہی کو مل پاتا۔

بہر حال خیمہ پہنچ کر پتا چلا کہ عرفات کے لیے روانگی قریب ہے۔ فقط ضعیفوں کے لیے بس کا انتظام ہے باقی لوگوں کو پیدل چلنا ہے جو کہ پرلطف، پُرسکون اور تھکا دینے والا ہے۔عرفات تقریباً سات آٹھ کلومیٹر دور ہے۔ بہر کیف ضروری سامان لے کر ہم پاپیادہ عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک وقت تک چلنے میں مزہ آتا رہا لیکن پھر ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ ہمارا جب کبھی قافلہ تھوڑا ستانے کے لیے رکتا تو ایک میاں بیوی بھی ساتھ آئے ہوئے تھے رکتے ہی وہ بیوی اپنے شوہر کی ایڑیاں اور قدم دبانے لگتی۔ پانی پلانے کے لیے بوتل کا ڈھکن بھی کھول کر دیتی۔ میں اس آدمی کو دیکھ کر رشک کرتا اور بیوی (جو زندگی کی بہترین ساتھی، ہمدرد اور مہربان رفیق ہوتی ہے) کی کمی محسوس کرتا۔ یہی حال مولانا عبد الرحمن صاحب قاسمی کی اہلیہ کا بھی تھا جو پھرتیلے بدن کی صحت مند عمر دراز خاتون تھیں لیکن ان کے شوہر شوگر کی وجہ سے ایک پیر سے معذور ہو گئے تھے۔ میں نے ان (خالہ) کو دیکھا ہوٹل میں، مطاف میں، بس میں اپنے شوہر کی دل و جان سے خدمت میں لگی ہوتیں۔ ان کو وہیل چیئر پر بٹھانا، ایک پیر اور دوسرے مصنوعی پیر میں موزے اور جوتے پہنانا، شوگر کی وجہ سے اگر وہ چڑچڑاہٹ میں ڈانٹ دے تو اسے برداشت کرنا۔ خالہ کے ہاتھ کا لذت دار کھانا گجرات میں کئی بار کھایا ہے۔عمرہ کے دوران اپنے منہ کو کیپ وغیرہ کے ذریعہ کور نہیں کرتی تھیں اس لیے خالہ جان کا دیدار بھی ہو گیا تھا۔

بہر حال کئی مرتبہ وقفہ لینے کے بعد صبح کے قریب ہم مسجد نمرہ پہنچے جو آدھی عرفات میں ہے اور آدھی مزدلفہ میں ہے۔ لیکن ہمارا قیام اس سے مزید آگے شاید عرفہ کی دوسری طرف جبل رحمت سے کافی دور واقع تھا۔جبل رحمت وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنی اونٹنی پر وقوف فرمایا تھا۔لہٰذا اکثر لوگ مسجد نمرہ میں جمع بین الصلاتین کے بعد جبل رحمت چلے جاتے ہیں۔ پھر مغرب تک یہ علاقہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کا مسکن بنا ہوا

ہوتا ہے۔ جہاں لوگ دعاؤں میں زار و قطار رو رہے ہوتے ہیں۔ ذکر و اذکار، تسبیح اور تلاوت میں مگن ہوتے ہیں۔

ہم بھی اپنے خیمہ پہنچ گئے تھے اور یہ خیمہ نہیں تھا بلکہ میدان میں پنڈال ڈال رکھا تھا۔یہیں مغرب تک ہمیں قیام کرنا تھا۔ بھوک کی شدت بڑھ چکی تھی اور یہاں ٹور والا بھی ہاتھ کھڑے کر دیتا ہے کیوں کہ یہاں کھانا معلم کی طرف سے آتا ہے۔ظہر کے قریب کھانے کے ڈبے آئے۔ یہ سوچ کر کہ معلم کی طرف سے آیا ہے تو اچھا ہی ہوگا بھوک نے اور مچلا دیا۔ جب ڈبہ ہاتھ آیا تو اس میں ابلے ہوئے چاول پر ہلکے مسالے میں فرائے کی ہوئی مرغی کی ایک ٹانگ تھی۔ نہ چاولوں میں نمک اور نہ ہی مرغی کی ٹانگ میں کوئی سواد، منہ بھی گرمی کی شدت سے سوکھا ہوا تھا۔مرغی کے گوشت کا ٹکڑا ہے کہ چیونگم کی طرح چبے جارہا تھا لیکن حلق سے اتر کر نہیں دے رہا تھا اور چاول لقمے میں ہی نہیں آرہے تھے بکھرے بکھرے جارہے تھے۔ بہر حال بطور سد رمق کھا کر ظہر وعصر اپنے اپنے وقت پڑھ کر ذکر و اذکار اور دعاؤں میں لگ گیا۔ اتنا لمبا وقت دعاؤں میں گزارنا مشکل تھا اس لیے اپنے ساتھ لائی ہوئی دو کتابوں کی قراءت کی۔ اَلْحِزْبُ الْأَعْظَمُ، الْقَوْلُ الْبَدِيعُ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْحَبِيبِ الشَّفِيعِ.

مغرب کی نماز کے بعد عرفات سے مزدلفہ جانا تھا اور اب بھی بس کی سہولت ندارد تھی۔ اس لیے پیدل روانا ہو گئے۔ اب کی بار ایک میرٹھی جوڑا ساتھ تھا وہ بھی اپنے شوہر کی خوب خوشامدیاں کر رہی تھیں، میں سوچنے لگا کہ یہ بیویاں صرف حج میں آکر اتنی شریف بنتی ہیں یا ہندوستان میں بھی اس کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ خیر اس باتونی خاتون کے ساتھ سفر اچھے سے گزر گیا اکثر باتیں وہ اپنے شوہر ہی سے کر رہی تھی لیکن مجھ سے بات کرنے میں بھی اسے جھجک نہیں تھی۔ یہ دونوں راہبری حاصل کرنے لیے میرے ساتھ ہو لیے تھے۔ بہر صورت طریق المشاۃ پر چلتے چلتے ہم مزدلفہ پہنچ گئے اور دس سے بارہ بجے کے درمیان پہنچے، جب کہ بس صبح کے قریب پہنچی۔

مزدلفہ میں مسجد مشعر حرام کے پاس جبل قزح کے قریب حضرت نبی کریم ﷺ نے وقوف فرمایا تھا لیکن اتنے رش میں اور رات کے وقت مسجد مشعر حرام کی تلاش دشوار تھی اور چلتے چلتے پیروں نے تو جواب دے ہی دیا تھا بلکہ رانیں بھی ایک دوسرے سے مس ہوتے ہوتے چھل گئی تھیں اور ٹانگیں کشادہ کشادہ رکھ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ایک بس کی اوٹ میں ہم نے مغرب اور عشا

ایک ساتھ ادا کی اور رمی کے لیے کنکر محفوظ کر کے کھلے میدان ہی میں سو گئے۔ یہاں عام لوگوں کے لیے نہ کھانے پینے کی، نہ استراحت و استنجا کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ رات کے آخر حصہ میں اُٹھ کر کچھ عبادت کی اور فجر کی نماز کے بعد وقوف مزدلفہ کیا پھر سورج کے چڑھ جانے کے بعد آگے چلے۔ اب یا تو منٰی میں ہمارے خیمہ میں جا کر آرام کر سکتے تھے یا رمی جمار کر سکتے تھے اور اس وقت رمی کے لیے بہت زیادہ رش ہوتا ہے لیکن یہاں سے خیمہ کسی کو معلوم نہیں تھا اور مسجد خیف جو جمروں کے پاس ہے وہاں سے مجھے راستہ نقشے کی بنا پر پتا تھا اس لیے پہلے رمی کرنے کا ارادہ کیا۔ جمرات تک جانے لیے میٹرو کی بھی سہولت مہیا تھی لیکن اس کے لیے ایک پاس بنوانا ہوتا ہے جو ٹور والے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ہمارے پاس، پاس نام کی کوئی چیز نہیں تھی ہم کو میٹرو کے دروازے سے پیدل جانے کا دروازہ دکھا دیا گیا ہم ایک گھنٹے سے زیادہ چل کر جمرات پہنچے وہاں گویا کہ انسانی سروں کا سمندر تھا جو دھیمے دھیمے لبیک پڑھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے جہاں سے رمی فرمائی تھی یعنی ''بطن وادی'' وہاں تو بہت رش تھا اس لیے ہم چوتھی منزلہ پر گئے اور بِسْمِ اللهِ، اللهُ أَكْبَرُ، رِضًا لِلرَّحْمٰنِ وَرَغْمًا لِلشَّيْطَانِ. پڑھتے ہوئے جمرہ عقبہ کو سات کنکریاں ماریں اور مختصر دعا کر کے آگے بڑھ گئے۔

پھر میں نے اپنے ہم رکابوں کو اپنی رہنمائی میں خیمہ کی طرف چلا دیا جو راستہ مجھے پتا تھا وہ جانے کے لیے رانگ سائڈ واقع ہوا کیوں کہ دوسری سمت سے پورا حاجیوں کا جھنڈ تلبیہ پڑھتے ہوئے جمرات کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بہر حال جیسے تیسے ہم اپنے خیمے پہنچے اور پشت کو بستر سے لگایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ وضو کر کے آخری صف میں نیت باندھی کہ ایک حاجی صاحب کئی گھنٹوں سے چلتے چلتے خیمہ میں داخل ہوئے اور شریک جماعت ہوئے اللہ اکبر کہہ کر جب سب سجدے میں گئے تو وہ حاجی صاحب دھڑام سے گر گئے۔ مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے ان کے گھٹنے فولڈ ہی نہیں ہو سکے اور وہ گر گئے، اور بھی بہت سارے ہم قافلہ جو عرفات میں ہم سے جدا ہوئے تھے دو دو تین تین دن کے بعد ہم سے ملے۔

بہر حال اسی دن قربانی اور حلق بھی ہو گیا اور عورت کے علاوہ تمام چیزیں ہمارے لیے حلال ہو گئیں۔ عورت تو میرے ساتھ تھی نہیں اس لیے اس کا کوئی ٹینشن نہیں تھا۔ اسی دن کے گزر جانے کے بعد رات میں طواف زیارت کے لیے گیا۔ صبح سے ابھی تک کافی رش تھا، ٹیرس پر

سے میں نے طواف مکمل کیا پھر سعی کرنے سے پہلے مکہ ٹاور کے گراؤنڈ فلور پر جہاں دکانیں ہی دکانیں ہیں حج مکمل کرنے کی خوشی میں کچھ نوش کرنے گیا۔ اندر ایک ترکش ہوٹل پر کچھ پکوان کھائے اور ترکی قہوہ پیا۔ اسی درمیان ایک شخص ایک بڑی طشت میں مختلف اقسام و انواع کے ڈرائے فروٹ لے آیا جو لوگوں میں مفت بانٹ رہا تھا میں نے موقع غنیمت جانا اور مٹھی بھر لی پھر سعی کے درمیان ان کو کھاتا رہا۔

مسفلہ کے پرانے طرز کے ہوٹل میں مکہ مکرمہ کے آخری ایام گزر رہے تھے اور اب اس ہوٹل سے ایک قسم کی انسیت ہوگئی تھی۔ حج ہوجانے کے بعد عبادت کا پہلے جیسا جوش وخروش باقی نہیں رہا تھا۔ مدینہ منورہ کی طرف روانگی کی اطلاع و افوہ نے دماغ کا پکوان کرر کھا تھا۔ بار بار طواف الوداع کی نیت سے طواف کر کر کے آرہا تھا لیکن مدینہ منورہ جانا پس و پیش کا شکار تھا۔ کسی دن ٹور والے تیار رہنے کہتے ، سامان وغیرہ باندھ لیا جاتا پھر سفر کے رد کردیے جانے کی اطلاع آجاتی۔ اسی اثنا میں، میں بھی اپنی لین الطبع پر باقی نہیں رہا اور بمبییے پر آ گیا ، لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا جلد میں نے سوچ لیا کہ اپنا سفر مدینۃ الرسول ان کی وجہ سے برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اب میں کتاب میں پڑھی ہوئی بات کے مطابق نعتیں زیادہ پڑھنے لگا اور ایک مختصر سیرت کی کتاب پڑھنے لگا تا کہ شوق زیارت دل میں مزید شعلہ زن ہو۔

بالآخر ایک روز ہوٹل کے نیچے مدینہ منورہ بس آ لگی اور میں جلدی جلدی طواف وداع کے لیے دوڑا۔ کافی حسرتوں اور یاس و امید سے بھرا یہ طواف تھا۔ رونا یاد تو نہیں لیکن یہ دعا بکثرت پڑھ رہا تھا اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْهُ آخِرَ الْعَهْدِ بِبَيْتِكَ الْحَرَامِ. اے اللہ! اس حاضری کو آخری حاضری نہ بنا۔ بار بار کعبہ کی طرف نگاہیں یہ سوچ کر پڑ رہی تھیں کہ پتا نہیں پھر دیدار ہو نہ ہو۔

بہرحال میں ہوٹل آیا اور بس میں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ گیا ہوٹل کے پاس ہی سے ”شارع طریق الھجرۃ“ تھا بس وہیں سے گزرتی ہوئی مکہ مکرمہ کی آبادی سے باہر نکل گئی رفتہ رفتہ کلوک ٹاور بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس وقت خوشی وغمی کی ایک ملی جلی کیفیت ہوتی ہے۔ دل فیصلہ نہیں کر پاتا کہ خوشی زیادہ مناؤں یا غم زیادہ کھاؤں۔ مکہ مکرمہ سے جانے کا غم ہوتا ہے اور زیارت مدینہ الحبیب کی خوشی ہوتی ہے۔ بس میں اکثر خوشی ہی دیکھی جارہی تھی۔ لوگوں کی زبان پر درود شریف جاری تھا۔ کچھ ہری پگڑی والے بھی تھے وہ نعت خوانی میں مشغول تھے۔ میں بھی یہ اشعار گنگنا رہا تھا مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ بڑا لطف دیتا ہے نام مدینہ ۔۔۔

محمد کا روضہ قریب آرہا ہے بلندی پے اپنا نصیب آرہا ہے

کھڑکی سے باہر وہ ناہموار راستے دیکھتا جارہا تھا جن سے گزر کر کبھی حضرت نبی کریم ﷺ نے ہجرت کی تھی پھر اس کے بعد نہ جانے کتنے اسفار کیے تھے اے سی لگژری بس میں یہ سفر لوگوں کو تھکا دیتا ہے تو حبیب خدا اور حبیبان حبیب نے ان اسفار کو کیسے طے کیا ہوگا؟ کیا ان کا جذبۂ ایمانی ہوگا جو نہ جھلسا دینے والی گرمی سے ماند پڑتا تھا اور نہ اینٹھ دینے والی کڑکڑاتی ٹھنڈ سے سرد پڑتا تھا بلکہ جب کوئی سختی پہنچتی تو ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہوجاتا تھا۔

رات کے آخری پہر ہم مدینۃ الرسول پہنچے شارع ابوذر رضی اللہ عنہ پر مسجد نبوی سے تقریباً آدھا کلو میٹر دور ایک درمیانہ ہوٹل میں ہمارا قیام ہوا۔ یہاں ٹھنڈ کافی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر ہم نے آرام کیا اور ظہر کے وقت روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے نکلے۔ یہاں پر بھی کئی نعتیں میں لکھ کر لایا تھا انھیں گنگناتے ہوئے درود شریف پڑھتے ہوئے آگے بڑھا۔ مسجد نبوی پہنچ کر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی پھر دعائیں مانگی۔ اس کے بعد باب السلام سے داخل ہوکر صلاۃ و سلام پیش کرنے کے لیے گیا۔ رش کافی تھا اس لیے میں نے مختصر صلاۃ و سلام یاد کیا تھا اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُولَ اللهِ، الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا حَبِیبَ اللهِ، الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا خَیْرَ خَلْقِ اللهِ. چنانچہ بھیڑ کے ساتھ میں بڑھتا رہا اور حلقۂ رسول کے سامنے کھڑے ہوکر یہ مختصر درود شریف پڑھا پھر ایک دو قدم کے فاصلے پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر مختصر صلاۃ و سلام بھیجا اور باہر نکل کر قبلہ رخ ہوکر دعائیں مانگیں اور گنبد خضراء کی زیارت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ مدینہ منورہ کے جو آداب ہیں ان سے تو میں سراسر خالی تھا لیکن علماء اور بزرگوں کے قصۂ محبت اور واقعۂ عشق سن رکھے ہیں ان جیسا کرنے کی کچھ کوشش کی اور اس بات کا اہتمام کیا کہ زیادہ سے زیادہ وقت مسجد نبوی میں گزرے۔ زیادہ نمازیں اور تلاوت تو مجھ سے ہوتی نہ تھی تو میں مسجد نبوی کے مختلف حصوں میں جو حلقۂ درس قرآن و درس حدیث لگتا تھا اس میں شریک رہتا۔

عصر بعد اور فجر بعد جنۃ البقیع کھلتا ہے اس کی زیارت کرتا۔ بندے کے دو دوست مدینہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے ان کے ساتھ یونیورسٹی کا معاینہ کیا۔ اونٹ کے گوشت کا برگر اور اونٹ کا دودھ پیا۔ مسجد قبا، مسجد قبلتین، جبل احد اور اس کے علاوہ کئی زیارت گاہیں دیکھیں۔

یہاں بھی ٹور والے نے صاحب ہوٹل کو کرایہ مکمل ادا نہیں کیا تھا اس لیے فندق التقوی کی طرح اس ہوٹل سے بھی نکلنا پڑا اور دور کسی چھوٹے ہوٹل میں آخر کے چار دن گزارنے پڑے اور اس مرتبہ تو کھانا بھی بند کر دیا البتہ سخت لفظی نوک جھونک کے بعد ایک دن کے چالیس ریال کھانے پینے کے دیے، جس سے ہم اپنی من پسند کی چیزیں بازار سے خرید کر کھالیتے۔ پاکستانی ہوٹل بنسبت دوسرے ہوٹلوں کے سستا پڑتا تھا۔

مدینہ منورہ کے آٹھ دن دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے اور روانگی کا وقت آن پہنچا۔ بھیگتی آنکھوں سے سب آخری زیارت کر کے آئے اور سامان رکھنے کی گہما گہمی اور آپسی ہماہمی کے بعد بس میں سوار ہوئے۔ ہر سنجیدہ حاجی کے چہرے پر اداسی عیاں تھی۔ مسجد نبوی کے اونچے میناروں کو بار بار مڑ کر لوگ دیکھ رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو چھلکا رہے تھے۔ جب بس مدینہ منورہ سے باہر نکلی تو اچانک لوگ ٹور والے کو غائبانہ کوس رہے تھے کیوں کہ جدہ کا لمبا سفر اور پھر وہاں ویٹنگ بھی تھی لیکن ساتھ میں اس نے کھانے کے ڈبے نہیں دیے۔ نہ کھانے کا انتظام کیا نہ پانی کا اور نہ کھانے کے عدم انتظام کی اطلاع دی کہ مدینہ منورہ ہی سے ساتھ حاجی ازخود خرید کر رکھ لیتے۔ چار و ناچار راستوں کے ہوٹل سے یا ایئر پورٹ کے مہنگے ہوٹل سے کھانا لے کر کھانا پڑا۔

جدہ ایئر پورٹ پر پہنچ کر ایک احساس مجھے ابھی تک یاد رہا کہ دل کی جو کیفیت مکہ مکرمہ میں یا مدینہ منورہ میں تھی ابھی وہ بالکل بھی باقی نہیں ہے۔ گناہوں سے بچنا دشوار نہیں لگ رہا تھا جیسے کبھی رمضان نکل جانے کے بعد ہوتا ہے۔ بہر حال ہم جہاز میں سوار ہو کر ممبئی پہنچے۔ گھر والے سب لینے آئے ہوئے تھے شفا بھی عبد اللہ کو لے کر آئی تھی۔ عبداللہ تو اتنا اچھا نہیں لگا اس کی ماں اچھی لگی۔ اس کے بعد ہی عبد الرحمن کا نمبر لگ گیا لیکن عربوں کی کوئی خوبی ابھی اس میں نظر نہیں آتی، نہ مدینہ منورہ کی کھجوروں کا اثر نظر آتا ہے نہ آب زم زم کا۔

اللہ تعالیٰ میرے اور میرے عرفاتی بھائیوں کے اس حج کو حج مبرور بنائے اور عبدالرحمن میں عربوں کی خو بو پیدا فرمائے اور تمام بچوں کے نصیبہ کو دینی و دنیوی اعتبار سے چمکادے۔ آمین یا رب العالمین

چوتھا عمرہ

حضرت نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد چار عمرے کیے۔ ایک عمرۂ صلح حدیبیہ، دوسرا عمرۂ قضا، تیسرا فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے بعد جعرانہ سے عمرہ اور چوتھا حجۃ الوداع کے ساتھ ۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ حج کے لیے مستقل سفر کرنا اور عمرہ کے لیے علیحدہ سفر کرنا فقر کو ختم کرتا ہے۔ لہٰذا یہ آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ جو بکثرت حج اور عمرہ کا سفر کرتا ہو وہ تنگ دستی میں مبتلا ہوگیا ہو اور فاقوں کی نوبت آ گئی ہو۔

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ.

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کی دلی چاہت پر کئی بار آسمان سے حکم اترا ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا حق عمر کے دل و زبان پر جاری ہوگیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد خلافت میں حج تمتع (یعنی حج کے سفر میں عمرہ) کرنے سے منع فرمادیا تھا تا کہ لوگ حج افراد کریں اور عمرہ کے لیے مستقل سفر کرکے آئیں۔ جس سے ایام حج کے علاوہ بھی مسجد حرام معتمرین اور طواف کرنے والوں سے آباد رہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے جب سن چھ ہجری میں خواب دیکھا کہ صحابہ حلق کروا رہے ہیں، کعبہ شریف کا طواف کر رہے ہیں اور آپ نے یہ خواب صحابہ کو بیان کیا تو (چوں کہ نبی کا خواب بھی وحی قطعی ہوتا ہے، البتہ اس خواب میں سال کی تعیین نہیں تھی) تمام صحابہ سفر عمرہ کے لیے بے قرار ہوگئے۔ آپ ﷺ نے بھی صحابہ کی بے کلی کو دیکھتے ہوئے عمرہ کا سفر فرمایا۔

رمضان میں عمرہ کرنے کی ترغیب حضرت نبی کریم ﷺ نے یہ کہہ کر دی ہے کہ رمضان کا عمرہ حج کی طرح ہے۔

اور حضرت ابرہیم علیہ السلام کی دعا اِجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِم. کی برکت سے لوگوں کے دل اس بابرکت سرزمین کی طرف کھنچے ہوئے ہیں اور اس دعا کے اندر یہ اشارہ بھی ہے کہ لوگوں کو اپنے دلوں کا میلان اس پاک بابرکت زمین کی طرف کرنا چاہیے۔

ان تمام باتوں سے یہ باور کرانا مقصود ہے کہ عمرہ کے لیے مستقل سفر کرنا ایک اہم

قربت، صحابہ اور ان کے اتباع کا توارث اور لائق تقلید عمل، قابل عمل حکم اور باعث ثواب و برکت سنت ہے۔

عربوں میں اس کا کافی رواج اور چلن ہے۔ فی الحال جزیرۃ العرب کے اسکولوں کی تعطیلات ہیں تو حرم پاک میں کافی رش اور ازدحام دیکھنے میں آیا۔ برصغیر اور انڈو و ملائی کے بھی کافی معتمرین و زائرین ہیں، البتہ ہند و پاک سے جیسا التفات ہونا چاہیے وہ ناپید ہے۔

صَحِيحُ الْبُخَارِيِّ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ، أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ سُمَيٍّ مَوْلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ السَّمَّانِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ.

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا يَحْيَى، عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ، عَنْ عَطَاءٍ، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، يُخْبِرُنَا يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِامْرَأَةٍ مِنَ الْأَنْصَارِ - سَمَّاهَا ابْنُ عَبَّاسٍ فَنَسِيتُ اسْمَهَا-: مَا مَنَعَكِ أَنْ تَحُجِّي مَعَنَا؟ قَالَتْ: كَانَ لَنَا نَاضِحٌ، فَرَكِبَهُ أَبُو فُلَانٍ وَابْنُهُ - لِزَوْجِهَا وَابْنِهَا-، وَتَرَكَ نَاضِحًا نَنْضَحُ عَلَيْهِ، قَالَ: فَإِذَا كَانَ رَمَضَانُ فَاعْتَمِرِي فِيهِ، فَإِنَّ عُمْرَةً فِي رَمَضَانَ حَجَّةٌ أَوْ نَحْوًا مِمَّا قَالَ.

اس حدیث میں رمضان کے عمرہ کو حج کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک عمرہ کثرت سے کرنا مستحب ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال میں ایک سے زائد مرتبہ عمرہ کرایا اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں بھی ایک سال کے اندر دو تین عمرے کئے۔

سفر طابہ

علماء وصلحاء کا عمل متوارث رہا ہے کہ وہ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے بعد روضہ مبارک کی زیارت کے لیے مدینہ کا سفر کرتے ہیں۔ ہم بھی بس میں سوار ہوئے، چھ سات گھنٹوں کا یہ سفر بس کے مائیک پر آپسی مذاکرے، نعت گنگنانے اور ورد درود پاک میں گزر رہا تھا مجھے بھی کچھ مذاکرے

کا موقع دیا گیا تو میں نے اپنے ہم راہوں کو چند باتیں گوش گزار کرائیں۔

بندے نے کہا کہ ہمارا یہ سفر بڑا بابرکت ہے۔ ہم مدینہ کے لیے، مسجد نبوی کے لیے، زیارت روضہ کے لیے اور براہ راست آپ پر صیغۂ خطاب سے سلام پیش کرنے کے لیے جارہے ہیں، ہر ایک کی مستقل فضیلت ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے حج کیا پھر میری قبر کی زیارت کی تو گویا کہ اس نے مجھے میری زندگی میں دیکھا ہے۔

عَنْ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوعًا: مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِي بَعْدَ وَفَاتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي. (مِشْكَاةٌ) (تَكَلَّمَ فِيهِ الْعُلَمَاءُ فِي صِحَّتِهِ)

زیارت قبر اطہر کے بارے میں مستقل علماء نے کتابیں لکھی ہیں، اس کی فضیلت کو اور اس کے لیے سفر کرنے کی فضیلت کو ثابت کیا ہے۔

اہلِ سنت والجماعت (بشمول ائمہ اربعہ رحمہم اللہ) کا اجماعی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف میں زمین کا جو حصہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر اور اعضاءِ مبارکہ سے ملا ہوا ہے زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا کعبہ (بیت اللہ)، عرش اور کرسی سب چیزوں سے افضل ہے۔

میں نے کہا کہ ہمارا یہ سفر اس وجہ سے بھی فضیلت کا حامل ہے کہ ہم مسجد نبی کی طرف رواں دواں ہیں۔ جس میں نماز پڑھنے کی فضیلت ہزار درجہ بڑھی ہوئی ہے۔ ایک روایت میں چالیس نمازیں تکبیر اولی کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت آئی ہے کہ نفاق اور جہنم سے چھٹکارے کا پروانہ دیا جاتا ہے۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: مَنْ صَلَّى فِي مَسْجِدِي أَرْبَعِينَ صَلَاةً لَا يَفُوتُهُ صَلَاةٌ، كُتِبَتْ لَهُ بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ، وَنَجَاةٌ مِنَ الْعَذَابِ، وَبَرِيءَ مِنَ النِّفَاقِ. (تَعْلِيقُ شُعَيْبِ الأَرْنَؤُوطِ: إِسْنَادُهُ ضَعِيفٌ لِجَهَالَةِ نَبِيطِ بْنِ عُمَرَ.)

اس مسجد میں ایک حصہ ہے جس کو جنت کا باغیچہ کہا گیا (میرے ممبر اور قبر / بیت کے درمیان جو قطعۂ زمین ہے وہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے) بعض علماء نے اس کو حقیقت پر محمول کیا کہ یہ حصہ جنت سے اتارا گیا ہے، بعض حضرات اس کو تمثیل قرار دیتے ہیں،

کسی بھی مسجد/ عمارت کی فضیلت اس کے بانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا اس میں عبادت کرنے والوں کی وجہ سے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصی اور مسجد قباء کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ اس کے بانی انبیاء ہیں اور ان مسجدوں میں انبیاء نے اپنے اپنے وقتوں میں عبادت بھی انجام دی ہے تو چوں کہ ریاض الجنۃ کو حضرت نبی کریم ﷺ کی طویل مدت کی عبادت کا شرف حاصل ہے تو گویا وہ جنت کی کیاری ہے۔

میں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا یہ سفر اس وجہ سے بھی باعث خیر و برکت اور قابل شرف و منزلت ہے کہ ہم "مدینہ" کے قریب تر ہوتے جارہے ہیں جس کو ہجرت رسول ﷺ سے پہلے یثرب کہا جاتا تھا پھر اسے "مدینۃ الرسول ، المدینہ" کہا جانے لگا، حضرت نبی کریم ﷺ نے اسے اور بھی کئی نام دیے جیسے "طابہ، طیبہ"۔ حضرت نبی کریم ﷺ کو مدینہ سے اس قدر محبت تھی کہ اس کے پہاڑ سے بھی محبت فرماتے اور کہتے جبل احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ نے مدینہ منورہ میں برکت کے لیے وہی دعائیں کیں جو حضرت ابرہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے کی تھی بلکہ آپ نے اس سے ڈبل برکت کی دعا فرمائی، حتی کے اہل مدینہ کے صاع اور مد میں بھی برکت کی دعا فرمائی، مکہ مکرمہ کی حدود حرم ہیں وہ محترم بقعہ ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کے لیے حرم مقرر کیا۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا کہ مدینہ بھٹی کی طرح ہے جو خالص چیز کو باقی رکھتا ہے اور میل کچیل کو دور کرتا ہے، آپ نے مدینہ منورہ کے بارے میں یہ بھی پیشن گوئی کی کہ مدینہ میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہوں گے اور قرب قیامت ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ جائے گا جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ جاتا ہے (یعنی اس کا کوئی حصہ بل کے باہر نہیں رہتا)۔ آپ ﷺ نے یہ بھی کسی وقت فرمایا کہ جو شخص اس بات کی استطاعت رکھتا ہے کہ وہ مدینہ میں مرے تو چاہے کہ وہ ایسا کرے اس لیے کہ میں اس کے لیے سفارش کروں گا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دعا فرماتے: اے اللہ! اپنے رسول کے شہر میں شہادت کی موت عطا فرما اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ سے باہر جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ (مذکورہ حدیثیں صحیح سند سے ثابت ہیں)

اس سفر کی فضیلت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ ہم صیغۂ خطاب سے حضرت نبی کریم ﷺ پر صلاۃ و سلام پیش کرتے ہیں۔ اَلصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ،

الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَبِيبَ اللهِ، الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَيْرَ خَلْقِ اللهِ.

اور حضرت نبی کریم ﷺ اس کو سنتے ہیں اور جواب مرحمت فرماتے ہیں۔

مدینہ مدینہ مدینہ مدینہ بڑا لطف دیتا ہے یہ شہر مدینہ

حدیث شریف میں یہ بھی ہے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: المَسْجِدِ الحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالمَسْجِدِ الأَقْصَى. (ترمذی)

یعنی سواریوں کو کسی (عبادت کی نیت سے) سفر کے لیے تیار نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجدِ حرام، میری یہ مسجد (مسجدِ نبوی) اور مسجدِ اقصیٰ۔

دار العلوم کنتھاریہ میں اساتذہ سے ملاقات

حضرت مولانا رشید احمد صاحب سلوڑی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے پر بندے نے مولانا اسماعیل صاحب بھڑکودروی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کنتھاریہ میں افتاء کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کی سفارش پر مفتی اسماعیل صاحب سارودی دامت برکاتہم کی کنتھاریہ میں موجود دار الافتاء میں قیام کیا اور داخلے کی کاروائی مکمل کرکے وہاں سے فارغ بھی ہوگیا۔

اب تقریبا ۱۴ سال بعد ہمارے دوستوں نے وہاں جمع ہونے کا پروگرام بنایا۔ اللہ تعالیٰ کوتاہی معاف فرمائے اپنے مادر علمی سے ۱۴ سال دور رہنا بڑی احسان فراموشی کی بات ہے۔

لیکن یہاں کے اساتذہ کا بڑاپن ہے کہ بہت محبت سے ہم کو وقت دیا، ملاقات کی، سرگزشت دریافت کی، خدمات سے خوش ہوئے۔

حضرت استاذ مفتی یوسف صاحب ایلولوی کی عنایات ناقابل نسیان رہیں۔ مدرسہ میں طعام کا اور گھر پر تنکہ کا انتظام فرمایا اور باوجود کثیر شغل کے بھرپور وقت دیا اور استفادا فرمایا۔

اور میرے بارے میں ایک بات کہی کہ مجھے پہلے ہی سے پتا تھا کہ یہ طالب علم کچھ کام کرے گا۔ کسی نے میرے نکاح کی خبر ان کے خوش گزار کردی تھی شاید۔

مفتی صاحب نے اس سلسلے میں بہت مزاح فرمایا۔ میں نے بھی ازراہِ مزاح کہا کہ مفتی صاحب میری دو کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے ''حیات زوجین کا اسلامی خاکہ'' اور ''عورت بیوی کے روپ میں'' لیکن کوئی تقریظ لکھنے والا نہیں مل رہا ہے۔ مفتی صاحب سمجھ گئے کہ تعریض کررہے ہیں۔ مفتی صاحب نے ہند کا مولانا طارق مسعود قرار دیا لیکن یہ میرے قد سے بہت اونچی بات ہے۔ وہ اپنے تعدد میں کامیاب ہیں اور میں کامیابی کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچا۔ مفتی صاحب ہماری طالب علمانہ باتوں سے باتیں ملا کر ہمیں مستفیض کرتے رہے۔

مولانا الیاس صاحب سے دار الافتاء میں ملاقات کی ان سے بھی رد فرق باطلہ اور بہت سی مزاح کی باتیں ہوئیں۔

مولانا مفتی احمد صاحب سے کتب خانے میں ملاقات کی ہر ایک استاذ دل کھول کر ملتا اور تعلق نہ رکھنے کا شکوہ نہ کرتا۔ مولانا نے کہا کہ اس عمر میں بھی مدرسہ آنا پڑتا ہے ورنہ ''خالہ'' کہے

گی کہ کیا گھر گھر میں جاؤ مدرسہ وہاں پر اور اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کو تو مارتی بھی ہے۔مولانا نے کہا کہ ہنسی مذاق تو چلتی رہے گی لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں؛ ایک توفیق خداوندی، دوسری مدد خداوندی۔ اس کے بغیر کچھ نہیں (شاید یہی دو باتیں کہیں)

ایک وسیع ہال میں حضرت مولانا امتیاز صاحب مقرر خوش بیان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کو بھی میرے صاحب ثلاثہ ہونے کی اطلاع دے دی گئی یہاں بھی مجلس پر میرا ہی تذکرہ چھایا رہا۔ مولانا نے ممبئ آتے جاتے دار الافتاء آنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔

پھر میں نے کوشش کی کہ اگلی تمام ملاقاتوں میں مفتی زین العابدین کی تشکیلِ نکاح ہی کی طرف موضوع سخن پھیر دیا جائے ، لہٰذا آگے اس کا خیال رکھا۔

سب دوستوں نے بھی خوب تشکیل کی۔مفتی عمران موسمی چوس چوس راغب کرتے رہے۔

دوست احباب میں بھی کافی تال میل تھا مزاحانہ گفتگو اور ظرافتیں اپنی حدود میں تھی۔

ملاقات کے بعد کب جدائی کا وقت ہوگیا پتا ہی نہیں چلا۔

مفتی سرفراز کے یہاں پر تکلف ضیافت ہوئی۔ گھر کی ننھی ننھی بچیوں نے مہمانان گرامی کا اپنے جیسے صاف شفاف گلاس میں پانی پیش کیا۔ ایک بڑے دسترخوان پر سب ساتھی بیٹھ گئے۔ تلی مرغ سے شروعات ہوئی پاپڑ ، چھاچھ، قورمہ اور بڑے کی بریانی دسترخوان پر خالی ہوتی گئی تا آں کہ تمام ساتھی سیر ہوگئے۔

مفتی عمران میری سرگزشت سننے کے کافی مشتاق تھے انھوں نے جھولتی کرسی پر علحدہ بٹھا کر دریافت کیا اور بندے نے ان کو ساری روداد سنادی۔ وہ کافی محظوظ ہوئے اور اپنے قہقہوں سے مجھے مزید سنانے کی دعوت دیتے رہے لیکن خلوتوں کی باتیں جلوتوں میں اچھی نہیں لگتیں۔

ہمارے محرک عبد الوحید اور زین العابدین اس کے بعد تمام ساتھی سہیل، عمران، نعیم، سرفراز ہم سبھی کے شکر گزار ہیں ، بالخصوص مفتی نعیم کے جو دس ہزار خرچ کر کے تشریف لائے۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں سے خوب دین کا کام لے اور اسی طرح ملنے ملانے کی توفیق عطا فرمائے۔

———

ایک سفر: ڈوڈھ، بھدرواہ، گل ڈنڈی (جموں وکشمیر)

پندرہ دن پر محیط سفر فرار تین ریاستوں اور شہر دہلی پر مشتمل رہا۔ان میں بالخصوص سیاحت کشمیر کو گوش گزار کرانا مقصود ہے۔آخری دو دن جموں وکشمیر میں گزرے۔میں جموں اسٹیشن سے باہر نکل کر بس اڈے سے مولوی اخلاق کشمیری کی ہدایت کے مطابق ڈوڈھ سٹی کی بس میں سوار ہوگیا۔یہ ڈھائی سو روپے میں پانچ گھنٹوں کا سفر ہے لیکن پرلطف، حسین اور روح افزا سفر ہے۔بل کھاتی سڑکوں پر بس برابر دوڑتی رہتی ہے اور باہر کے منظر آنکھوں کو لذت ،دماغ کو تازگی اور دل کوسکون دیتے ہیں۔باہر دیکھتے جاؤ،لطف لیتے جاؤ۔خوبصورت پہاڑ اور پہاڑ پر بے ہنگم درخت ،درخت پر سبز پتے اور چوں کہ ابھی موسمِ خزاں ہے اس لیے بہت سے درخت پتوں سے خالی تھے۔جگہ جگہ پہاڑوں سے صاف وشفاف ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری ہیں۔قدرے فاصلے پر کئی جگہ چھوٹی بڑی ندیاں دو اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان بہہ رہی ہیں۔پہاڑوں کے دامن میں اور پہاڑوں پر بھی بستیاں بسی ہوئی ہیں۔پہاڑوں پر بہت سی جگہوں پر زمین ہموار کرکے ان کو قابل کاشت بنایا گیا ہے جن پر عموماً ہری گھاس ہی اگتی ہے۔یہ قابل کاشت زمین اوپر سے سیڑھی نما معلوم ہوتی ہے۔بستیوں میں گھر کافی فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور ان بستیوں کے سرے پر کہیں مسجد اور کہیں مندر نظر آتا ہے۔بہت سی اچھی جگہوں پر جیسے کسی پہاڑی کی چوٹی یا لبِ سڑک چشمہ کا پانی بہنے کی جگہ ایسی مخصوص جگہوں کو منتخب کرکے مندر بنائے گئے ہیں۔بعد میں مولوی اخلاق نے بتایا کہ یہ ہندوؤں کا منصوبہ ہے کہ چنندہ خوبصورت مقامات پر مندر بنائے جائیں اور اس معاملہ میں ان کو چھوٹ بھی دی گئی ہے۔بعض مرتبہ اس سلسلے میں مسلم سیاسی حکمراں بھی بھائی چارگی کی آڑ میں اپنا تعاون پیش کرتے رہتے ہیں۔

شام چار بجے ڈوڈھ شہر پہنچ گیا۔جو کشمیر میں اپنی خوبصورتی آپ رکھتا ہے اسی شہر میں بس اڈے سے کچھ فاصلے پر مولوی اخلاق کا مدرسہ ”انوار العلوم اکرم آباد“ ہے اور جناب اس مدرسہ کے سرپرست اعلیٰ ،رئیس جامعہ، مہتمم، کرتا دھرتا غرض سب ہی کچھ ہیں۔جامعہ ڈابھیل ہی کی طرح ایک نوٹس بورڈ ہے جس پر جامعہ کے حضرت مہتمم صاحب کی طرز پر ایک اعلان آویزاں تھا کہ ”پیر تک تمام حفظ کے طلباء مدرسہ میں آجائیں۔وقت پر حاضر نہ ہونے والے طلباء کے

ساتھ سخت کارروائی ہوگی۔'' خادم مدرسہ انوار العلوم اخلاق احمد عفی عنہ

آپ نے وہاں علماء وعوام میں اچھی پکڑ بنا رکھی ہے۔اپنی خوش گفتار ، نیک کردار ،خندہ پیشانی اور عمدہ اخلاق سے ہر خاص و عام میں مقبول ہیں۔

اکرم آباد کی مرکزی جامعہ مسجد کے امام وخطیب بھی ہیں۔فجر کی نماز کے بعد قرآن لے کر بیٹھتے ہیں اور تقریباً تمام مصلی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔دو جوان کھڑے ہوکر ہر ایک کو قرآن دیتے ہیں اس کے بعد چند افراد سے تجوید کے ساتھ کوئی سورت ناظرہ سنتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور عام فہم تفسیر کرتے ہیں۔بعد ازاں ''فضائل اعمال'' پڑھتے ہوئے درمیان میں تفسیری کلمات کا اضافہ کرتے ہیں۔انھوں نے بعد میں اس طرز تعلیم کی تفصیل پیش کی کہ کئ مہینوں میں فجر کے بعد ہی مصلیوں کا نورانی قاعدہ مکمل کروایا اور حروف تہجی کی مشق نمازِ فجر کے بعد ہی چھ ماہ تک کروائی ۔مولوی اخلاق نے اپنی مسجد کو صرف جائے نماز ہی نہیں بلکہ تعلیم گاہ بنایا ہوا ہے اور اپنی مسجد کے مصلیوں کو صرف نمازی ہی نہیں بلکہ طالبِ علم بھی بنایا ہے۔اپنے مدرسہ کے استاذ ذی استعداد بھی ہیں۔جو دیگر استاذ کتاب نہیں پڑھاتے محترم خود پڑھا لیتے ہیں۔تجوید پر خاصا زور دیتے ہیں اور کیوں نہ دیں قاری رضوان صاحب اور بڑے قاری صاحب کے طالبِ علم اور قاری قرآن جو ٹھہرے اور اپنے مدرسہ سے چندے والوں کے لیے تصدیق نامے بھی جاری کرتے ہیں اور اس علاقے میں آئے ہوئے چندہ وصول کنندہ آپ ہی کے مدرسہ میں قیام کرتے ہیں۔جناب ایک اور اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔وہ ہے عامل،بابا گیری،آسیب زدہ،مسحور،مجنون اور نظر بد کے مارے ہوؤں کا قرآن سے علاج کرتے ہیں۔ان تمام خدمات کی وجہ سے ڈوڈھ میں کوئی مسلمان ہی ایسا ہوگا جو مولوی اخلاق کو پہچانتا نہ ہو۔غیر مقلدین،دنیا پرست،عصری تعلیم یافتہ ہر ایک کو مولوی اخلاق نے اخلاقِ کریمانہ سے اپنا گرویدہ اور مدرسہ کا خیر خواہ بنا رکھا ہے۔

میرا اسم کارڈ تو بند ہو چکا تھا اس لیے کسی اور سے فون لے کر مولوی اخلاق کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دی۔کچھ ہی دیر میں مولوی اخلاق آ کر مدرسہ انوار العلوم اکرم آباد لے گئے۔مدرسہ پہاڑ پر بہت ہی خوبصورت علاقے میں واقع ہے۔مدرسہ انوار العلوم لمبی لمبی دو بلڈنگوں پر محیط ہے۔اسی کے اوپر دوسرے منزلہ پر مولوی اخلاق اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے ہیں۔مدرسہ کے اوپر والے پہاڑی حصہ پر بھی بستیاں ہیں اور نیچے والی پہاڑی حصہ پر بھی بستیاں ہیں۔اسی

وجہ سے مدرسہ کی چھت پر مٹی کا میدان ہے۔ جہاں طلباء اپنے فرصت کے اوقات میں والی بال، فٹ بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔ مدرسہ سے اوپر والی بستی کے روڈ تک تقریباً آدھا کلومیٹر سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے وہاں کے بچے اور بوڑھوں کے لیے یہ ایک عام سی بات ہے۔ صبح صبح ساڑھے آٹھ بجے کے قریب چاندی کی طرح صاف، کلیوں کی طرح مہکتے، موتیوں کی مانند چمکتے، چہچہاتے اور باتیں کرتے ہوئے کشمیری بچے اور بچیاں ان ہی سیڑھیوں سے چڑھتے ہیں۔ بعض اسکولوں کے یونی فارم کی جرسی سرخ رنگ کی تھی۔ حسین بچوں کو سرخ جرسی میں دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صبح صبح گلاب کھلے ہیں۔

مدرسہ چوں کہ اونچائی پر ہے جس کے بائیں طرف ڈوڈھ شہر اور اس کی خوبصورت بستی اور محلے ہیں۔ یہ شہر ایک وادی نما علاقے میں ہے اس کے ارد گرد پہاڑی سلسلے ہیں۔

مدرسہ کے سامنے دائیں جانب بھی حسین پہاڑی سلسلہ ہے۔ پہاڑوں کے پیچھے تاحد نگاہ پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ آخری پہاڑ فلک بوس اور برف پوش نظر آتا ہے۔ جیسے اس پہاڑ کو برف کی چادر اوڑھا دی گئی ہو۔ مدرسہ کے بالکل سامنے جو پہاڑ ہے اس پر قرینے سے فاصلے فاصلے پر گھر بنے ہوئے ہیں۔ اس میں بل کھاتی سڑکیں ہیں اور وہ پل بھی قریب نظر آتا ہے جس تک پہنچنے میں بس سے آدھا گھنٹہ لگتا ہے۔ مدرسہ کے سامنے سے دریائے چناب بہتا ہے جو پاکستان تک پہنچتا ہے۔

مدرسہ کے بائیں جانب اوپر نیچے دونوں بستیوں کے درمیان میں جامع مسجد اکرم آباد ہے جہاں مولوی اخلاق امام ہیں۔ وہاں پہنچنے کے لیے ایک قبرستان سے گزرنا پڑتا ہے۔ قبرستان بھی پہاڑ پر سلیقے سے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بنا ہوا ہے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی دو قبریں سامنے دکھائی دیتی ہیں۔ مرحومہ فاطمہ بیگم زوجہ غلام قادر مرزا اور مرحومہ شفیعہ بیگم زوجہ محمد شفیع صوفی، میں نے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی مصیبت دائمی نہیں رکھی۔ ایک نہ ایک دن ضرور ختم ہوجاتی ہے۔ (یہ مزاح تھا)۔

بہرحال زینے نما قبرستان سے گزر کر بڑی جامع مسجد ہے۔ وہاں کی ساری مساجد گہرے سبز رنگ کی ہوتی ہیں اور مسجد کی چھت پر ڈھلان کی ساخت پر چاروں طرف ٹین، پترے ڈلے ہوتے ہیں اور اس پر درمیان میں ایک چھوٹا سا گنبد ہوتا ہے۔ یہ مسجد بھی ایسی ہی تھی۔ البتہ بڑی

ضرور تھی اور اندر سے لکڑیوں سے مینا کاری کی گئی تھی۔

مولوی اخلاق احمد نے بندہ کو مدرسہ کے خصوصی مہمان خانے میں ٹھہرایا جس میں ضروری تمام سہولتیں ڈبل بیڈ پلنگ، اس پر نرم گدا، گرم کمبل اور گرم پانی وغیرہ سب موجود تھیں۔

شام میں عصر پڑھ کر مولانا اپنی کار میں بٹھا کر اپنے اہل خانہ سمیت اپنے گھر ''مالنی'' لے گئے۔ یہ راستہ بھی پرلطف تھا۔ راستے کے دائیں بائیں حسین مناظر آنکھوں کو خیرہ کر دیتے تھے۔ میں آگے بیٹھا اور مولوی اخلاق کی اہلیہ جو ہر کار خیر میں آپ کے ساتھ شریک رہتی ہیں۔ تیرہ سالہ لڑکا محمد، دو سالہ لڑکا احمد اور بچی عائشہ پیچھے بیٹھے تھے۔

درمیان میں مگاموڑ پر جہاں مولوی اخلاق کے چچازاد بھائی کا ''بگ بائٹ'' نامی عمدہ ترین ہوٹل ہے جس میں خوش ذائقہ، لذیذ پکوان اور قہوے دستیاب ہوتے ہیں۔ مولانا نے پہلی ضیافت یہیں کروائی۔ راستے میں آپ کی اہلیہ کی فرمائش پر تیکھے کلچے بھی کھا چکے تھے۔ یہاں بگ بائٹ میں زعفرانی قہوہ جس پر بادام کا برادا ڈالا گیا تھا نوش کیا اور تازہ دم ہو گئے۔

آگے کچھ دور کے فاصلے پر مولانا کا گھر آ گیا۔ مغرب بعد ہم گھر پہنچے تھے اندھیرا ہو چکا تھا۔ راستہ کے ایک کنارے پر کار پارک کر دی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر کہاں ہے اور یہ کہہ کر گاڑی کیوں رکائی کہ گھر آ گیا؟ یہاں تو کوئی گھر نہیں ہے؟ جب گاڑی سے سامان اتار لیا گیا اور مولوی اخلاق نے بیگ اور اپنے دو سالہ بچے کو گود میں اٹھالیا تو سب پہاڑ پر چڑھنے لگے، اوپر چڑھنے کا کچا راستہ تھا۔ میں بہت سنبھال سنبھال کر ڈرتے ڈرتے چڑھ رہا تھا لیکن مولوی اخلاق اور ان کے اہل وعیال سرپٹ اوپر چڑھے جا رہے تھے۔ کافی اوپر چڑھنے کے بعد گھر آیا میں تو ہانپ رہا تھا اور یہ سب اس کے عادی تھے۔ یہاں پر بھی مولوی اخلاق نے کشمیری طرز پر بنے عمدہ گرم مہمان خانے میں ٹھہرایا اور ضیافتیں کیں، پہلے پھل پیش کیے گئے، کچھ دیر بعد فربہ کشمیری بکرے کی بریانی دسترخوان پر رکھ دی گئی، کشمیر کے اس علاقے میں کھانے سے پہلے طش (ہاتھ دھونے کا برتن) لاتے ہیں اور کھانے کے بعد ایک دستی لاتے ہیں جس سے ہاتھ دھوئے بغیر صاف کرتے ہیں۔

مولوی اخلاق کا گھر کشمیری دیہات میں پہاڑ پر واقع ہے۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا بہتا ہے۔ پہاڑ اور رات کے سناٹے میں اس کے بہنے کی آواز برابر آتی رہتی ہے۔ گھر کے سامنے

والے پہاڑ پر واقع گھروں کی بتیاں رات کے اندھیرے میں یوں دکھائی دیتی ہیں جیسے ستارے جگمگا رہے ہوں۔ گویا آسمان دھرتی پر اتر آیا ہو۔ بہت ہی خوش نما منظر ہوتا ہے۔ ان پہاڑوں کے اوپر آسمان کا سرا شروع ہوتا ہے۔ اس پر بھی ستارے چمک رہے ہوتے ہیں۔ مہمان خانے میں نہایت ہی پرسکون نیند آئی، درمیان کوہ بندے کی یہ پہلی نیند تھی۔

فجر بعد چائے بسکٹ آگئے، کچھ دیر بعد ناشتہ آ گیا۔ جس میں مختلف قسم کی روٹیاں تھیں۔ رومالی روٹی، سادی روٹی اور پراٹھے، سبزی اور آملیٹ کے ساتھ، دو طرح کی چائے (عام چائے اور نمکین چائے)۔

اس کے بعد ہم بھدرواہ اور گل ڈنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں مگا موڑ بگ بائٹ میں ایک بڑے کپ میں قہوہ نوش کیا اور ایک سحر زدہ دوشیزہ کا جن اتارا۔ صاحب ہوٹل نے دوپہر کے کھانے کی دعوت پیش کی۔ اگلا پڑاو بھدرواہ تھا۔ یہاں سے مفتی شاہ محمد صاحب کو ساتھ لے لیا۔ یوں ہمارا کارواں تین افراد پر مشتمل ہوگیا۔ مفتی صاحب اپنے ساتھ مرغی کا قورمہ اور تندوری روٹی لائے تھے۔ جو بعد میں پہاڑ پر بیٹھ کر تناول کیا گیا۔

مفتی شاہ محمد نہایت خوش مزاج، بہترین اخلاق کے مالک ہیں۔ کسی سے بھی بہت جلدی گھل مل جاتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے ان کی دل پسند باتیں سفر کے مزے کو برقرار رکھتی ہیں اور سستی وتکان کو دور رکھتی ہیں۔ ان سے مل کر احساس ہی نہیں ہوا کہ یہ پہلی ملاقات ہے۔ دار العلوم کے پڑھنے کے زمانہ میں حضرت الاستاذ مولانا قاری عثمان صاحب منصور پوری سابق صدر جمیعت علمائے ہند و نائب مہتمم دار العلوم دیوبند کے خادم رہے ہیں۔

ان کے ہمراہ بھدرواہ سے اوپر گل ڈنڈی کی سیر کی گئی اور یہ محترم گاڑھی اردو سے ہم کو محفوظ کرتے رہے۔ ایک چھوٹا مدرسہ اور ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ بھی یہیں بھدرواہ میں چلاتے ہیں جو مدرسہ خیر المدارس سے موسوم ہے۔

گل ڈنڈی، پہاڑ کا وہ اونچائی والا علاقہ ہے جو ہمیں دور سے فلک بوس اور برف پوش پہاڑ نظر آتا تھا۔ یہ سیر و سیاحت اور دماغ کو تر و تازہ کرنے کی ایک بہترین جگہ ہے۔ جہاں سیاح بکثرت آتے ہیں۔ پہاڑوں پر سفید صاف و شفاف برف جمع ہے۔ اوپر بھی برف، نیچے بھی برف اور سڑک پر بھی برف تھا لیکن اس کو مشین (کٹر) کے ذریعہ کنارے کر دیا گیا تھا اور جگہ جگہ

''دیوار'' (بفتح الدال) نامی درخت لگے ہوئے ہیں جو ساگوان کی طرح قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔
اگر کسی کو فکریں اضطراب میں مسلسل مبتلا کیے ہوئے ہوں یا دماغ غم و غصے کے مارے تپ رہا ہو تو اسے یہاں کی سیر ضرور کرنی چاہئیے۔

واپسی پر ہم نے مفتی صاحب کے مدرسہ کا دورہ کیا وہاں قہوہ اور کشمیری میٹھے کلچے کھائے۔ بعد ازاں مفتی صاحب اپنے گھر لے گئے جو کچھ ہی فاصلے پر تھا۔مفتی صاحب کا گھر انتہائی خوبصورت مقام پر ہے۔چاروں جانب برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں۔خدا کرے اس علاقہ میں ہمارا آشیانہ بھی ہو۔آمین۔موتی جیسے دو بچے آئے۔انہوں نے دسترخوان بچھایا اور چائے کے ساتھ تلی ہوئی مرغی،فرائی انڈے،بادام، کشمیری شہد اور بیکری کی اشیا سے دسترخوان سجادیا۔کشمیر کے اس علاقے میں یہی معمول ہے کہ دستر بچھانے اور اس پر کھانے اور دیگر لوازمات کو چننے کی ذمہ داری گھر کے نونہالوں کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد مولوی اخلاق کی بہن کے گھر گئے۔وہاں پر بھی چائے اور کشمیری پوری سے ضیافت کی گئی۔جو نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ تھی۔ان ضیافتوں سے پیٹ اس برے طریقہ سے پر ہوگیا تھا کہ مزید کچھ کھانا پیٹ پر ظلم ہوتا لیکن کشمیری مہمان نوازی ابھی اور باقی تھی۔واپسی پر جب ہمارا گزر مگاموڑ سے ہوا تو ان ہی صاحب ہوٹل نے روک لیا اور کھانے کے لیے کہا۔ میں نے معذرت کر دی اور تاکید کے ساتھ کہا کہ پیٹ میں بالکل گنجایش نہیں ہے۔اس پر مالک ہوٹل نے خفا ہوتے ہوئے کہا کہ آپ نے صبح وعدہ کیا تھا کہ واپسی میں کھائیں گے حالاں کہ ہم نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن یہ ان کے اصرار کا طریقہ تھا کہ میز بان انکار نہ کر سکے۔ہم نے کہا کہ ٹھیک ہے۔انہوں نے پوچھا کیا کھائیں گے؟ بکرا، مچھلی، چکن اور دیگر کشمیری وازوان۔ہم نے کہا کہ کباب لے آؤ تو وہ کچھ ہی دیر میں دنبے کے کشمیری طرز پر بنے ہوئے،ڈرائی فروٹ کا چھڑکاؤ کیے ہوئے کباب لے آئے۔لذت سے بھر پور کباب کھانے کے بعد ہم گھر چلے آئے۔

گھر پر بچوں نے استقبال کیا اور مہمان کی واپسی پر خوش ہوئے۔یہاں بھی رات کا کھانا ہمارا منتظر تھا۔نماز سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کیا،پھر بچوں نے دسترخوان بچھادیا۔طش لاکر ہاتھ دھلوائے اور دسترخوان پر تین طرح کے لذیذ پکوان چن دیے: کشمیری رشتہ (راکے کسرہ کے ساتھ)، کشمیری طرز کے ابلے ہوئے انڈے تل کر ہلکے مسالے والا انڈا کڑی اور مرغی کا سالن۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم مدرسہ انوار العلوم لوٹ آئے، رات پرسکون گزری۔ فجر کی نماز کا وقت بڑا دلکش تھا مولوی اخلاق نے پوچھا یہ ڈوڈھ اچھا ہے یا وہ گل ڈنڈی اچھا تھا؟ اسی طرح کا سوال وہ گل ڈنڈی میں بھی کر چکے تھے کہ گل ڈنڈی کا علاقہ اچھا ہے یا سری نگر اچھا تھا؟ جہاں میں پہلے جا چکا تھا تو میں نے کہا. آپ نے اس سے پہلے بھی اس طرح کا سوال کیا تھا۔ بھائی! مجھے تین بیویاں رکھنے کی وجہ سے ہر ایک کی الگ الگ خوبی بیان کرنے کا تجربہ ہے۔ وہاں کی خوبصورتی الگ تھی۔ یہاں کی خوب صورتی اور خوب صورتی کے مناظر جدا جدا ہیں۔ ہم تقابل نہیں کرتے تناول کرتے ہیں یعنی جو مل جائے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔

خیر چائے ناشتہ کے بعد روٹی ناشتہ سے فارغ ہوئے مولوی اخلاق نے اخروٹ کا ہدیہ پیش کیا اور ہم اگلے سفر کی طرف روانہ ہو گئے۔ روٹی ناشتہ میں پوری سبزی، آملیٹ، دیسی گھی، شہد اور چائے تھی۔

———

ہنگامی سفر

۲۵-۲۶ فروری کو راقم الحروف کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ فوراً ممبئ سے روانگی اور روپوشی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ میرا موبائل فون بھی ہاتھ سے جاتا رہا اس لیے گھر سے نوکیا کا سادہ سا موبائل فون اور ایک جوڑی کپڑا لے کر نکل کھڑا ہوا۔

بیکری پر جا کر کچھ پیسوں کا انتظام کیا۔ چونکہ اپنے اس سفر کے بارے میں مطمئن نہیں تھا اس لیے اسکوٹر چالو کر مفتی وسیم صاحب کے پاس ممبئ سینٹرل اور مولانا شاہد صاحب کے پاس وڈالا پہنچ گیا۔ پھر جب کوچ کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا تو جوگیشوری مرکز گیا اور مولانا حمزہ صاحب سے مدرسہ کی چھٹی لی۔ ان کو بھی اپنی کچھ سرگزشت سنائی تو انہوں نے اپنا نمبر مجھے دیا اور کہا کہ کچھ بھی ضرورت ہو تو مجھے فون کرنا۔ اس کے بعد میں دار الافتاء گیا اتفاق سے وہاں امام صاحب مل گئے اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ثابت ہوئی انہوں نے بھی میری پریشانی کو سمجھا اور یہاں کے بارے میں بے فکر رہنے کا اطمینان دلایا۔ مزید یہ کہ چند عمدہ نئے کپڑے سلے سلائے، راستے کے لیے گرم رومال (قصیدہ) اور سامان رکھنے کا بیگ دے دیا۔ بالکل بے سروسامان جو گھر سے نکلا تو بہت حد تک اللہ تعالیٰ نے سامان مہیا کرا دیا تھا۔

دار الافتاء ہی میں اپنی بائک کھڑی کر کے میں باندرہ ٹرمینس دہرادون ایکسپریس پکڑنے کے لیے پہنچا اور مظفر نگر کا ٹکٹ لے کر میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین خالی تھی اوپر کی سیٹ پر بیگ پر سر رکھ کر صبح تک سوتا رہا اور کافی اطمینان والی نیند آئی۔ سفر طویل تھا۔ نہ پاس میں موبائل تھا نہ کوئی کتاب، فکرات اور سوچیں تھیں۔ سوچتا رہتا سوتا رہتا، سوچتے سوچتے، سوتے سوتے یہ تیس گھنٹے کا سفر پورا ہوا۔ دوسرے دن صبح ۶:۱۵ کو مظفر نگر اسٹیشن پر اترا۔ ٹھنڈ ممبئ اور سورت کی بنسبت کافی زیادہ تھی۔ پاس میں قصیدہ کے علاوہ کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ لہٰذا کرتے پر دوسرا کرتا پہن کر ہاتھوں کو بغل میں دبا کر اسٹیشن کے سامنے ہی سے سہارنپور جانے والی بس میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔

مظفر نگر سے سہارنپور جانے والی سڑک پہلے کے مقابلے میں کچھ اچھی ہے لیکن جس وکاس کا شور ہم ممبئ میں رہتے ہوئے یو-پی کے بارے سنتے رہتے تھے ایسا کوئی وکاس نہ بس میں نظر آیا نہ ہی سڑک اور دکانوں میں۔ وہی کھڑ کھڑاتی ہوئی کھڑکیوں والی بس، دو سیٹوں کے درمیان

فاصلہ کافی کم، لمڈھینگ تو کجا میانہ قد کے گھٹنے بھی زخمی ہو جائیں۔ راستے میں گڑھے آنے پر پیچھے بیٹھنے والے شخص کا آدھا فٹ تک اچھل جانا، بس اسٹاپ کے علاوہ راستے میں کسی بھی موڑ پر رک کر کنڈیکٹر کا سہارنپور سہارنپور سہارنپور کی آواز لگانا، ڈرائیور کا بلا ضرورت اور خواہ مخواہ ہارن بجانا یا ضرورت سے زیادہ بجانا، بس میں چڑھ کر کسی نیم حکیم کا دھویں دار تقریر کر کے اپنی چورن یا گولیاں بیچنا، کراری مونگ پھلی، لے لو چرمٹر، کھٹی میٹھی ٹافی والے ان سب آوازوں کے درمیان بس روانہ ہوئی۔ ہاں اتنا وکاس ضرور دیکھنے میں آیا کہ اب لوگوں کے پاس سائیکل رکشا کے بجائے ای رکشا تھی۔ اگر پندرہ سال میں اتنا بھی بدلاؤ نہ ہو تو یہ تغیر پذیر دنیا کہاں رہی۔

صبح آٹھ بجے کے قریب بس نے دارالعلوم دیوبند کے پیچھے والے روڑ پر اتارا۔ میں نے اوپر سے پہنا ہوا کرتا اتار کر بیگ میں رکھا۔ پچھلے دروازے سے جو دارالقرآن اور ثانویہ کی جانب ہے دارالعلوم میں داخل ہو گیا۔ میرے پانچ، چھ طلباء یہاں زیرِ تعلیم ہیں۔ بس انہیں کی معرفت سے یہاں ایک دو دن قیام کرنا تھا لیکن یہ وقت امتحان کا تھا سب طلباء دارالعلوم کی عظیم الشان لائبریری کے امتحان ہال میں جا چکے تھے۔ اس لیے ایک طالب علم حمزہ بن مولوی شاہد سلمہ جو بغرض سماعت دارالعلوم میں مقیم تھے، ان کو فون کیا لیکن انہوں نے بھی فون نہیں اٹھایا۔ بعد میں معذرت کی کہ مفتی صاحب میں سو گیا تھا۔ لہٰذا میں از خود مہمان خانہ گیا لیکن وہاں گیٹ پر ہی روک دیا گیا کہ ابھی چند دنوں کے لیے مہمان خانہ اصحاب شوری کے لیے مخصوص کیا گیا ہے کسی بھی مہمان کو قیام کی اجازت نہیں ہے۔

بہر حال میں باب قاسم سے ہو کر باب مدنی سے نکلا اور مسجد رشیدیہ کے سامنے والی سڑک پر آ گیا۔ یہاں حلیم بریانی کا ٹھیلہ لگا تھا اور مجھے بھوک بہت تیز لگی تھی۔ لہٰذا اس سے تیس روپے والی پلیٹ بنانے کے لیے کہا۔ اس نے گرما گرم بریانی ڈالی اس پر گرم گرم حلیم، دو بوٹی، پیاز، لیموں اور چٹنی ڈال کر پلیٹ میری طرف بڑھائی۔ ٹھنڈ میں گرم گرم حلیم بریانی کھانے میں لطف ہی آ گیا۔ حلیم بریانی والے سے کسی ہوٹل کا پتہ پوچھا تو بالکل قریب میں ہاتھ کے اشارہ ہی سے بتا دیا۔ چھ سو روپے میں روم بک کر کے میں گہری نیند پھر سو گیا۔

سو کر اٹھنے پر مجھے کئی فون آ چکے تھے رابطہ کرنے پر پتا چلا کہ بندے کے طلباء کھانے پر ظہر بعد مسجد قدیم میں طلب کر رہے ہیں۔ مسجد قدیم میں ظہر کی نماز پڑھ کر وہ مجھے مسجد قدیم

کے احاطے میں کمرہ نمبر ۶ میں لے گئے۔ وہاں دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے ناظم مولانا شفیق صاحب سلطانپوری سے ملاقات ہوئی۔ یہ کمرہ انہیں کو دارالعلوم دیوبند نے اعزازی طور پر دے رکھا ہے۔مولانا موصوف ہمارے ادارہ دینیات کے ساتھی ہیں وہاں تقریباً آٹھ ، دس سال خدمت انجام دی ہے وہاں بھی کافی لگن، محنت ،جد و جہد اور خودداری سے کام کیا ہے۔ ایچ آر کے عہدے تک ترقی کی پھر اپنے ٹکٹ کے کاروبار کو کافی بڑھایا۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے بطور ناظم کتب خانہ بلاوا آ گیا ۲۰۱۵ء سے اب تک برابر دارالعلوم کے عظیم الشان کتب خانہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ کافی بوسیدہ کتابوں کو جدید ٹیکنیک کے ذریعے محفوظ اور لائق استفادہ بنا رہے ہیں۔ کتب خانہ جو سست روی کا شکار تھا اس کو منظم کر کے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ نیز تمام درسی وغیر درسی کتابوں پر بار کوڈ لگا دیا ہے جس سے طلباء کو کتابیں جمع کرنے میں اور کتب خانہ کے عملہ کو وصول کرنے میں بے انتہاء آسانی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی موصوف کے کئی قابل قدر کام ہیں۔

دارالعلوم (مدرسہ) سے لایا ہوا کھانا ختم ہو چکا تھا اس لیے مولوی عمر ریشم والا نے باہر سے ایک کلو مرادآبادی بریانی آرڈر کر دی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا شفیق صاحب سے ان کی ملاقات کا وقت مانگا۔ انہوں نے کہا کہ میں دوپہر ۱۲ بجے تک پھر ظہر سے عصر اور مغرب سے عشاء تک کتب خانہ میں ہی ہوتا ہوں آپ کبھی بھی بلا جھجھک تشریف لا سکتے ہیں۔ چنانچہ ظہر سے عصر کے درمیان مولانا سے اس حصہ میں ملاقات ہوئی جہاں تمام فارسی کی کتابیں تھیں اور اپنی داستانِ دل خراش گوش گزار کی۔سن کر مولانا نے کافی مفید مشورے دیے اور دیوبند میں کچھ زیادہ دن رکنے کا مشورہ دیا جس پر عمل بھی کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند جو بندے کا مادر علمی بھی ہے تقریباً چار دن رہا اور یہ چار دن کافی اطمینان سے گزرے۔ دن رات میں تقریبا دس گھنٹے میٹھی نیند سویا اور ایسا سکون اور اطمینان اور فارغ البالی بھی تقریباً چار سال بعد میسر ہوا۔ اسی اثنا میں چند کتابیں دارالکتاب سے خرید لی تھیں باقی وقت انہیں کے مطالعہ میں گزرتا کیونکہ نہ ساتھ اینڈرویڈ موبائل تھا، نہ ذاتی نمبر ہی تھا، نہ کہیں پہنچنے کی فکر تھی، نہ کسی کے بازپرس کا کوئی ٹینشن، علاوہ ازیں طلباء ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔ کپڑے دھلوا کر لا رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو ملاقات کے لیے لا رہے تھے ایسی عزت دے

رہے تھے جو کئی مہینوں کی بے عزتی کو کسی حد تک مندمل کر رہی تھی۔ کبھی نصیحت طلب کرتے، کبھی تین بیویوں کے تجربہ کی جانکاری معلوم کرتے، کبھی دارالعلوم کے اساتذہ کی بات کرتے، کبھی دارالعلوم میں زیر بحث کسی بات کا تجزیہ کرتے۔ کچھ دن قبل غزوہ ہند کے متعلق دارالعلوم کے کسی فتویٰ سے متعلق بوال اٹھا تھا اور پولیس افسران کا اہتمام کے ساتھ آنا جانا لگا ہوا تھا۔ اس تعلق سے بھی مجلس گرم رہتی، مہتمم صاحب اور بحرالعلوم کی گفتگو کا تبادلہ ہوتا، مجھ ہیچ مداں سے بھی اپنا عندیہ پوچھا جاتا۔ راقم الحروف کو تقریباً پندرہ مہینوں سے الجھنوں ہی سے واسطہ ہے اس لیے کوئی عندیہ وندیہ دماغ میں آتا ہی نہیں تھا اور نہ نصیحت کرنے کا موڈ ہوتا، نہ ہی تجربہ شیئر کرنے کو ہی دل کرتا۔

میرے طلباء جو دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں۔ وہ یہ ہیں عمر ریشم والا تکمیل علوم مکمل کیا، اسماعیل ساکر والا افتاء مکمل کیا اور مدثر انصاری نے دورہ حدیث مکمل کیا۔ جنید نے دارالعلوم وقف سے افتاء مکمل کیا، صفوان نے وقف سے دورہ حدیث مکمل کیا اور حمزہ وہ درجہ پنجم میں سماعت کر رہا تھا۔ یہ سب طلباء فائن ٹچ کے تھے۔ بندے کے کچھ طلباء ڈابھیل بھی گئے، کچھ مظاہرالعلوم میں، کچھ فلاح دارین ترکیسر میں، تو کچھ دارالافتاء حیدرآباد میں افتاء کرنے بھی گئے لیکن طالب علمی کا جو رنگ ڈھنگ ان طلباء پر چڑھا ہے وہ دوسرے طلباء میں بالکل نظر نہیں آیا۔ حصول علم کا اور خدمت دین کا نیز بزرگ اساتذہ کی خدمت گزاری کا چسکا سا لگ چکا ہے۔ خصوصاً وہ طلباء جو دارالعلوم میں زیر تعلیم ہیں اچھے برے کی اچھی خاصی تمیز ہو چکی ہے، حق ناحق کی شناخت کر لیتے ہیں۔ کاروباری فائن ٹچی طلباء سے ہٹ کر ایک روایتی مولانا بن چکے ہیں۔

دیوبند میں، میں نے ان گلیوں کا بھی چکر لگایا جن میں کبھی زمانۂ طالب علمی میں پھرا کرتا تھا۔ مزارِ قاسمی، نودرہ دارالعلوم کی جدید عمارت، شاندار و عالیشان لائبریری جو واحد ایک ایسی لائبریری اور کتب خانہ ہے جس کی چھت پر ہیلی پیڈ ہے۔ ذی شان مسجدِ رشید یہ اور اطراف کے گلی بازار، سب جگہ گشت کرتا اور ذائقہ دار کھانے چکھتا۔ حلیم بریانی صبح کے ناشتے میں کافی لذت دیتی، حلیم بریانی درحقیقت ایک بیف پلاؤ ہوتا ہے۔ اس پر حلیم ڈال کر، پیاز بکھیر کر، لیموں نچوڑ کر اور خاص چٹنی اور مسالہ نچھاور کر کے محض ۳۰، ۸۰ اور ۱۰۰ روپے میں پیش کی جاتی ہے۔ بھورے بھائی کے سموسہ، لال املی دار چٹنی پر بھی ہاتھ صاف کیا، وہی پندرہ سال پہلے کا ذائقہ تھا۔

مظفر نگر والا شاورمہ جو درحقیقت مرغی قیمہ روٹی رول تھا۔شاورمہ کا ذائقہ اس میں دور دور تک نہیں تھا لیکن تھا لذیذ، کریم چکن کے چکن پکوڑے جن کی پہلی والی لذت برقرار تھی۔ پہلے یہ ہوٹل جامع مسجد کے پاس تھا اب جامع رشید کے بغل میں ہے۔مظفر نگر والوں کی نلی نہاری اور دودھ میں گوندھی ہوئی نرم بآسانی چبائی جانے والی تندوری روٹی، چکن اچاری، وائٹ چکن یہ سب وہاں کھایا۔مرادآبادی بریانی جو درحقیقت پلاؤ ہوتا ہے۔ اس کی خاص چٹنی کے ساتھ آج کل وہاں کافی مشہور ہے۔ اسی طرح تہاری بھی کافی ذوق اور شوق سے کھائی جاتی ہے۔تہاری کھا کر تو قاری ساجد صاحب کے ہاتھ کا پکوان یاد آ گیا تھا اور مدرسہ میں دوپہر کی دال اور شام کو بھینس کے گوشت کا شوربہ اسی ذائقہ اور اسی آن بان اور شان کے ساتھ اب بھی کھایا جاتا ہے۔ طلبہ اس میں بگھار لگاتے ہیں اور مدرسہ کی تندوری روٹی سے حاشیہ نکال کر تناول کرتے ہیں۔مسجدِ قدیم کے پاس چوراہے پر حافظ صاحب کا انگریزوں کے زمانے کا چائے خانہ بغیر کسی تبدیلی کے جوں کا توں موجود ہے۔ جہاں پہلے کی طرح کوئلوں پر چائے بنتی ہے اور صبح کا برتن شام تک چلتا ہے بس فرق اتنا ہوا ہے کہ اب پیپر کپ میں بھی چائے دی جاتی ہے۔

بہرحال دارالعلوم کے یہ ایام بہت خوشگوار گزرے بالآخر بادل ناخواستہ سنیچر کے دن دوپہر بارہ بجے دہرادون کے لیے روانہ ہوا۔

———

دہرادون میں دو دن

دہرادون جو اترا کھنڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ وہاں کی جدید عصری تعلیم، شاندار خوبصورت پہاڑی دامن میں بسے بہت سے ہاسٹل سے مشہور ہے۔ وہاں کے باسمتی چاول بھی لوگوں کو کافی پسند ہیں۔ فدوی کی سب سے بڑی بہن وہاں رہتی ہیں۔ دار العلوم کے پیچھے والے دروازے سے مظفر نگر والے روڑ پر سہارنپور جانے والی بس میں سوار ہو گیا تقریباً ایک گھنٹے بعد گا گالیڑی پر اتر کر دہرادون جانے والی بس میں چڑھ گیا۔ بس کھلے روڑ پر رواں دواں ہوئی یہ ڈرائیور صاحب بھی بلا ضرورت زور زور سے ہارن بجا رہے تھے۔ یہاں کی بسوں میں یہی دقت ہوتی ہے پیچھے بیٹھو تو جھٹکوں سے اچھلو، آگے بیٹھو تو ہارن سر درد کر دیتا ہے۔

دہرادون سے دہلی اور سہارنپور تک ایک سوپر ہائی وے کا کام چل رہا تھا جو ایک آدھ سال میں مکمل ہو جائے گا اس لیے راستہ تھوڑا کٹھن رہا لیکن پر لطف تھا۔ چھٹمل پور اور پہاڑی گنج کے بعد خوبصورت پہاڑ، سوکھی ندیاں، ہرے بھرے درخت نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں اور دل و دماغ کو تازگی دیتے ہیں۔ دہرادون سے ۲۰-۲۵/ کلو میٹر پہلے کا راستہ گولائی میں ہے۔ بس ان بل کھاتی سڑکوں پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔شہر قریب آتا ہے تو بڑے بڑے ہاسٹلس اور اسکولوں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

شہر سے باہر ہی بس اڈا ہے وہاں اتر کر وکرم نمبر ۷ میں سوار ہو کر پرنس چوک پر اترا، وہاں اتر کر پیدل بہن کے گھر پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں گھر میں داخل ہوا بہن رونے لگی حالانکہ کہ وہ مجھ سے تقریباً ۱۶/ سال بڑی ہیں، ہر ایک بہن بھائی سے بہت محبت کرتی ہیں۔ بہنوئی بھی بیمار ہونے کے باوجود نیچے اترے ہوئے تھے۔ بھانجہ بائک لیکر پرنس چوک مجھے لینے گیا ہوا تھا۔ نواسہ نواسی میرے آنے پر خوشیاں منا رہے تھے اور گود میں بیٹھے جا رہے تھے۔ اپنی اسکول، مکتب کی پڑھائی، نظمیں، پہیلیاں، کہانیاں سنا رہے تھے اور یہیں پر رمضان گزارنے کا وعدہ لے رہے تھے۔عبد الہادی جو ابھی فقط ۶ یا ۷/ سال کا ہے اس نے کہا کہ میں نے خود ایک پہیلی بنائی ہے۔اس کو بجھا کر بتائیں:ایسی کونسی چیز ہے جسے ہم کھاتے بھی ہیں، رکھتے بھی ہیں اور پھینکتے بھی ہیں؟ میں نے بہت سوچا لیکن کچھ دماغ میں آیا ہی نہیں تو اس نے کہا ”ناریل“۔ اس کو ہم کھاتے

بھی ہیں، اس کا پانی پیتے بھی ہیں بچ جائے تو فریج میں رکھتے بھی ہیں اور ختم ہونے پر پھینکتے بھی ہیں۔عبدالہادی بہت شرارتی ہے اپنی بہن سے چھوٹا ہے پھر بھی اس پر حاوی رہتا ہے۔ اس کی بہن علویہ نے کہا کہ یہ مجھے بہت ستاتا ہے، میں نے کہا کیوں ستاتے ہو بیٹا؟ تو کہا کہ ستاتا ہوں اور اس کے کان میں ''ہا'' کرتا ہوں یہ کہہ کر میرے کان میں اتنی زور سے ''ہا'' کرشور مچایا کہ کان کے پردے ہل گئے، سر گھوم گیا۔

بہرحال میرے آنے کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے باجی نے کھانے کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا بلکہ لوکی گوشت، دال چاول اور خریج (انڈے کی بھرجی) اور گرما گرم روٹیوں سے ضیافت کی۔ آگے کے دنوں میں قیمہ، مچھلی، ابلے ہوئے انڈے، کبھی آلو، کبھی گوبھی، کبھی قیمے کے پراٹھے سے خاطر تواضع ہوتی رہی۔ دن میں چار پانچ مرتبہ چائے کا دور چلتا۔

دہرادون ایک دلکش شہر ہے اور سیاحتی مقامات کے لیے مشہور ہے۔ ہمالیہ پہاڑ اسی کے مضافات سے شروع ہوتا ہے اور مسوری جو مشہور سیاحتی مقام ہے۔ یہاں سے ۳۵ر کلومیٹر ہے اور بھی قریب میں کئی تفریحی جگہیں ہیں۔ سہتسر دھارا، کیمٹی فال، دلائی ہلز وغیرہ تمام جگہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ ڈاکوؤں کی غار، دہرادون کے گڑھی کینٹ علاقہ میں واقعہ ہے۔ سہتسر دھارا کو نیچرل واٹر پارک کہا جاتا ہے۔ یہاں دور دور سے لوگ نہانے آتے ہیں۔ یہاں ایک گرم پانی کا چشمہ بھی ہے جس کو جلدی امراض میں مفید جانا گیا ہے۔

دہرادون کے لوگ تعلیم یافتہ، سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اتراکھنڈ کے دوسرے ضلعوں کے لوگوں کی طرح متعصب اور فرقہ پرست نہیں ہوتے۔ یہ وہ وقت تھا کہ اتراکھنڈ اور اتر پردیش کی وجہ سے اکثر علاقوں میں کاوڑ کی وجہ سے گوشت بند تھا لیکن دہرادون میں باآسانی دستیاب تھا۔ کچھ وقت پہلے ہی اتراکھنڈ میں ہلدوانی میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے تھے اور مسلمانوں کا جانی و مالی کافی نقصان ہوا تھا، یہی ایک پہلی ریاست ہے جو سب سے پہلے یونیفارم سول کوڈ نافذ کرنے جارہا ہے۔

جس دن میں دہرادون پہنچا اس دن کی شام سے دو دن تک یہاں تیز بارش کے ساتھ برف باری بھی رہی۔ ٹھنڈ ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی پورا دن گرم کپڑے پہنے رہنا پڑتا تھا۔

تیسرے دن میں سہارنپور مظاہر العلوم کے لیے روانہ ہوا۔ مجھے ایک دن وہاں گزار کر رات

تک واپس یہیں آنا تھا۔تقریباً دو گھنٹے کا سفر تھا میں بس پکڑ کر علماء کے شہر سہارنپور پہنچ گیا۔ یہاں اتر کر یکے بعد دیگرے کئی رکشا والوں سے کہا کہ مدرسہ جانا ہے ''مظاہرالعلوم'' لیکن کوئی مدرسہ کو جانتا ہی نہیں تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک شناسا سے محلہ کا نام معلوم کیا پھر کہیں جا کر رکشا والے کو ایڈریس معلوم ہوا۔

مدرسہ میں عمومی مہمان خانہ میں قیام کیا، گرم پانی کا اچھا انتظام تھا کئی دنوں بعد جی بھر کر نہایا۔ اس کے بعد مظاہرالعلوم اصل اور وقف دونوں کا گشت کیا بعد ازاں جامع مسجد کا رخ کیا دراصل جامع مسجد جانے کی دو وجہ تھی ایک تو وہاں کے ایک ہوٹل کا مشہور نلی نہاری دوسرا یہ کہ ایک واقعہ میں نے اپنے مرشد، شیخ حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری مد ظلہ العالی سے سن رکھا تھا کہ جس وقت بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مظاہرالعلوم میں مدرس تھے تو کسی وجہ سے عارضی طور پر وہ سہارنپور کی جامع مسجد میں امامت کے لیے تشریف لے جاتے اور مدرسہ کے گیٹ سے جامع مسجد کی سیڑھیوں تک مسلسل بازار ہے۔ لہٰذا آپ اپنی نگاہیں مدرسہ کے گیٹ سے جو جھکاتے تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہی اٹھاتے تھے۔

مجھے یہ دیکھنا تھا کہ مدرسہ سے جامع مسجد کتنی دور ہے۔ لہٰذا میں بھی حضرت بانیٔ تبلیغ کی اقتداء میں پیدل ہی گیا لیکن نیچے نہیں دیکھ سکا۔مسجد کافی دور ہے اور دہلی کی جامع مسجد کے کچھ مشابہ ہے۔ میں نے وہاں ظہر پڑھی اور کچھ وقت رک کر مثل ثانی ہی میں عصر بھی پڑھ لی اور وہاں سے قریب ایک بوسیدہ سے ہوٹل میں نلی نہاری کھائی تو کھانے کا سواد آ گیا اتنی لذیذ نلی نہاری میں نے زندگی میں نہیں کھائی تھی، دو روٹی کے ساتھ صرف ستر روپے میں۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میرے ایک دوست کا فون آ گیا اور ممبئی میں میرے پیچھے کیا ہوا اس کی خبر دی۔ سارا موڈ خراب ہو گیا طبیعت بجھ گئی۔ میں نے اپنا فون بند کر ڈالا اور دہرادون جانے کے لیے مغرب بعد بس اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں اسٹیشن کے بالکل قریب ایک مسلم ہوٹل تھا جس میں سو روپے میں کوفہ پلیٹ مل رہی تھی میں نے اس کا بھی حق ادا کیا اور چائے پی کر بس میں سوار ہو گیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا، ساتھ میں لائی ہوئی کتاب بھی نہیں پڑھ سکتا تھا بس دماغ ٹینشن اور ڈپریشن سے جوجھ رہا تھا۔ آخر کار اپنا نوکیا کا موبائل نکالا اور پہلی مرتبہ سانپ والا گیم کھیلا۔ دو گھنٹے کے بعد دہرادون آیا گھر پر مرغے کا شوربہ دسترخوان پر رکھا جا چکا تھا کھا کر

چائے کی چسکی لی اور بستر میں پڑ گیا لیکن رات ڈھائی بجے تک نیند نہیں آئی پھر ایک لمبا چوڑا میسیج لکھ کر اس دوست کو روانہ کیا اور سو گیا۔

صبح اٹھ کر بجنور جانے کی تیاری تھی لیکن بجنور جانے کا جو راستہ بڑا دلفریب، دلکش، دلخیز، حسین و خوبصورت ہے یعنی بس سے ہریدوار، نجیب آباد ہوتے ہوئے بجنور جانا وہ کاوڑیوں کی وجہ سے پرخطر تھا۔ یہ راستہ نہایت حسین المنظر ہے۔ بس پہاڑوں سے ہوتی ہوئی دریا اور نہروں کے کناروں سے گزرتی ہوئی جنگل بیابان میں بنے راستوں کو چیرتی ہوئی منزل تک پہنچاتی ہے۔

بہرحال ارادہ ملتوی ہو گیا اور بجنور کے بجائے نگینہ بذریعہ ریل جانا طے ہوا۔ لہٰذا ڈیڑھ بجے کی لنگ ٹرین پکڑ کر نگینہ کے لیے ٹرین میں بیٹھ گیا۔ جب گھر سے نکل رہا تھا تو بھی باجی خوب رو رہی تھیں اور میرے احوال سنور جانے کی دعا کر رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹفن بھی تیار کر دیا اور زبردستی ہزار روپے بھی پکڑا دیں۔ بہنوئی صاحب اسٹیشن تک ٹرین کا ٹکٹ نکال کر بیٹھا کر جاتے جاتے ناشتے کا سامان دیتے ہوئے گئے۔

———

وطن اصلی کی طرف

ریل گاڑی ہریدوار، لکسر، نجیب آباد ہوتی ہوئی نگینہ پہنچی۔ ریل گاڑی کے ڈبے میں تقریبا سب ہی غیر مسلم تھے۔ میں ہی ایک سفید کرتے پاجامہ میں چمک رہا تھا۔ ہریدوار جو ہندوؤں کی پوتر جگہ ہے اور یہاں مندروں اور مورتیوں کا شہر آباد ہے۔ گنگا بھی وہاں بہتی ہے بہت سے لوگ وہاں گنگا اسنان اور پوجا پاٹ کر کے اسی ٹرین سے لوٹ رہے تھے اور خواہ مخواہ اپنے ناحق معبودوں کا نام لے کر چیخ و پکار کر رہے تھے۔ ایک ہندو مجھے کہہ رہا تھا کہ رام کا نام لو اور آگے بڑھو، مصلحتِ وقت کے تحت میں خاموش رہا۔عصر سے کچھ پہلے نگینہ اسٹیشن آ گیا جو اپنی پرانی خستہ حالت ہی میں تھا۔ باہر نکل کر ای رکشا پکڑ کر پٹیری سرائے پرانی منصفی کے پاس کے لیے آگے بڑھا۔ای رکشابازار والے مین راستے کے بجائے گلی کوچوں سے لے جارہا تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ کاوڑیوں کی یاترا کی وجہ سے وہ راستہ گاڑیوں کے لیے بند کر دیا ہے صرف پیدل کاوڑ وہاں سے گزر سکتے ہیں۔ بہرحال کچھ ہی دیر میں اپنے آبائی گھر عبدالحفیظ منزل پہنچ گیا۔سن ۲۰۰۰ء سے پہلے جب ہم یہاں امی جان کے ساتھ آتے تھے تو گھر کے اہم کمرہ میں ہمارا قیام ہوتا تھا۔ اب اپنے ہی گھر میں بیٹھک (مہمان خانہ) میں، میں مقیم ہوا۔

گھر کی تفصیل اس طرح ہے دروازہ سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب دو کمرے ہیں۔ اس کے بعد گھر کا وہ اہم حصہ ہے جہاں ہم پہلے قیام کرتے تھے، دو کمرے اور ایک کوٹھری پر مشتمل ہے۔اس کے سامنے ایک چھوٹا سا برامدہ ہے، دروازہ کے بائیں جانب بیت الخلاء ہے۔ اس کے بعد مہمان خانہ پھر غسل خانہ ہے، اس کے بغل میں باورچی خانہ ہے، اس کے پاس دستی پمپ لگا ہوا ہے۔ گھر کے اوپر بڑی ٹیرس ہے اور اس کے ایک گوشہ میں دو منزلہ عمارت ہے جس کی چھت پر چڑھ کر میں پتنگ اڑاتا تھا اور ایک مرتبہ گر کر ہاتھ بھی ٹوٹ چکا ہے۔

دائیں بائیں کمروں کے درمیان ایک کشادہ جگہ ہے جہاں ہم موسم گرما کی رات میں مچھر دانی لگا کر سویا کرتے تھے۔یہیں پہلے ایک نیم کا اور ایک شہتوت کا درخت تھا۔ اس گھر کے ہر حصے میں میری پرانی یادیں جڑی ہیں۔سن ۲۰۰۰ء سے پہلے ہم تمام چھٹیاں یہیں گزراتے۔ تمام خاندان کے لوگ یہیں شادیاں کرتے تھے اور اب میں تقریباً ۱۵/ سال بعد یہاں رات گزار رہا تھا وہ

بھی ایک مہمان کی حیثیت سے، یہ ہے دنیا کی حقیقت جو مرنے سے پہلے بھی منہ موڑ جاتی ہے۔

بہرحال یہاں کی در و دیوار سے میری پرانی یادداشتیں وابستہ ہیں۔ یہاں کی ہوا، مٹی سے ایک انسیت ہے۔ دہرادون، دیوبند سے زیادہ مجھے یہاں اپنائیت محسوس ہوئی حالانکہ یہاں میرا اپنا کوئی نہیں سب بیگانے، انجانے تھے۔ بچپن کے دوست بھی منتشر ہو گئے تھے لیکن گھر کے اپنے ہونے کا احساس سکون دے رہا تھا۔ گھر میں جو لوگ رہ رہے تھے وہ بھی بچھے جا رہے تھے، گھر میں داخل ہوتے ہی چائے ناشتہ پروس دیا، گرم چادر اور بستر تیار کر دیا، کھانا بنانے کے لیے وہ بمشکل مرغا تلاش کر کے لائے تھے۔ اسے بنا کر رات کی ضیافت کی، میٹھے میں روا تھا، سونے سے پہلے چائے پیش کی گئی۔ باپ، بیٹے، والدہ بار بار پوچھنے آتے رہتے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے میں نفی میں سر ہلا کر لیٹ گیا لیکن اس جملے سے میں پندرہ سال پہلے ماضی میں پہنچ گیا جب میں دار العلوم دیوبند میں پڑھتا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نگینہ آیا تھا۔ ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور آنے کا مقصد ایک ضرورت تھی اور وہ تھی تلاشِ رشتہ۔ جن کی بیٹی مجھے پسند تھی میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے سامنے بات رکھی اگرچہ اشارہ و کنایہ میں بات کہی تھی لیکن ان سنی کر دی گئی۔

نگینہ کے گھر کا ایک واقعہ اور یاد آیا۔ میں اپنی امی کے ساتھ یہاں آیا ہوا تھا اور ہم کو ایک دن رک کر آگے ماموں کے گھر جانا تھا۔ اس وقت ہمارے گھر میں جو فیملی رہتی تھی ان کی ایک خوبصورت نوجوان بیٹی بھی تھی۔ چٹ پٹے اڑد گوشت کے بعد ان کی بیٹی ہی چائے لے کر آئی۔ امی جان برامدہ میں تھیں اور میں اندر کمرے میں تھا۔ امی کو چائے دینے کے بعد وہ کمرے میں میری طرف بڑھی کمرہ خالی تھا اور چڑھتی جوانی تھی۔ ایسے میں خطرات کا قوی امکان ہوتا لہٰذا ذرا فاصلے سے کچھ پیچھے پیچھے امی بھی پت نالے میں تھوکنے کے بہانے سے آ گئیں حالانکہ امی جان برامدہ میں تھیں باہر تھوکنا آسان تھا۔

پہلے کی دیندار ماؤں کا حال ہوتا تھا جو اپنی بچیوں ہی کی نہیں بلکہ لڑکوں کی بھی حفاظت کرتی تھیں کہ جوانی کی دہلیز میں کہیں پھسل نہ جائیں اور آج کل کی ماؤں کا تو کجا ابوؤں کا بھی حال برا ہے۔ اپنی نوجوان قریب البلوغ بچیوں کو بھی کسی ایسے رشتہ دار کے گھر رات گزارنے بھیج دیتے ہیں جس گھر میں کوئی ان کا غیر محرم بھی ہوتا ہے۔

بہرحال ماضی کی فلمیں سوچتے سوچتے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ فجر بغیر جماعت کے گھر ہی میں پڑھی۔ یہاں آ کر میں اپنی پسندیدہ مطعوم کھانے جامع مسجد پہنچا۔ یہاں پر کڑھے ہوئے دودھ کی ملائی اور قیمہ پوری بھر کر بنائی جانے والی ڈش کافی لذیذ ہوتی ہے۔ کاوڑ کی وجہ سے قیمہ پوری سے محروم رہا۔ صبح کے وقت کافی فریش تھا بہت دنوں سے کوئی مضمون نہیں لکھا تھا لہٰذا بسم اللہ پڑھ کر حضرت مولانا واجد حسین صاحب دیوبندیؒ پر مضمون لکھا جو تقریباً چار گھنٹے میں مکمل ہوا۔ بعد ازاں ظہر پڑھ کر بس میں بیٹھ کر بجنور (بخشی والے، ننھیال) کے لیے رختِ سفر باندھا۔

————

بجنور اور دہلی

بجنور میں تلارام کے رس گلے کافی مشہور ہیں اور بہت عرصے سے اس کی شہرت ہے۔ میں نے ماموؤں کے گھر کے لیے رس گلے لیے اور بس میں سوار ہو گیا۔ یہ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر ہے لیکن فی الحال راستہ بہت خراب ہے تو دو گھنٹے میں مکمل ہوا۔بجنور بس اڈے پر ماموں زاد بھائی (عظیم) اپنی کار لے کر لینے کے لیے آ گیا تھا اور میری فرمائش پر بڑے کے گوشت کے ساتھ اڑد گوشت بھی بنوائی تھی۔ظہرانے سے فارغ ہو کر آرام کیا،مغرب بعد سب سے چھوٹے ماموں ممانی اور دیگر رشتہ داروں کے گھر کا طواف کیا۔وہاں موجود ننھیالی پشتینی زمین دیکھ کر حسرت ہوئی جو کئی رقبہ پر محیط اور قیمتی ہے لیکن بہنوں کو حصہ نہ دینے کے رواج نے ہمیں اس سے محروم رکھا۔رات میں عظیم ہی کے گھر پر سویا، صبح دس بجے ''دہلی'' کے لیے بذریعہ بس روانہ ہوا۔ بس مظفر نگر، جانسٹھ، میرٹھ،غازی آباد ہوتی ہوئی دہلی پہنچی۔یہ پورا علاقہ زرخیز اور مردم خیز ہے۔نابغۂ روزگار شخصیت یہاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ زمین بھی تمام قابلِ کاشت ہے، بنجر زمین اور پہاڑ یہاں کم یاب ہیں۔

غازی آباد سے آگے جا کر جب بس دہلی سے قریب پہنچی تو وہاں ایک پہاڑ نظر آیا۔مجھے تعجب ہوا،تمام راستے پہاڑ نظر نہیں آیا اور یہاں واحد پہاڑ موجود ہے۔مزید تعجب اس پر ہوا کہ اس پہاڑ پر بلا مبالغہ لاکھوں چیل، گدھ اڑ رہے تھے اور لاکھوں ہی بیٹھے تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے پاس میں بیٹھے ایک شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ پہاڑ نہیں ہے بلکہ پوری دہلی کا کچرا ہے، پوری دہلی سے کچرا یہاں لا کر پھینکا جاتا ہے۔

بس نے اپنے مسافروں کو کشمیری گیٹ اتار دیا۔ وہاں سے بذریعہ میٹرو جامع مسجد دہلی گیا۔اس کا اصل نام ''مسجد جہاں نما'' ہے۔ جسے مغل بادشاہ، شاہ جہاں نے لال قلعہ کے سامنے تعمیر کروایا تھا۔ یہ پرانی دہلی کی مصروف ترین جگہ چاندنی چوک اور مینا بازار کے سامنے واقع ہے اور فنون تعمیر کا شاہکار ہے۔کئی سو برس گزر جانے کے باوجود اس کی شان، رونق علی حالہ باقی ہے۔مسجد کے احاطے میں نہایت وسیع صحن ہے۔ پہلے روزے کی افطاری کے بعد مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔

یہاں لوگ افطاری کرنے کے لیے دور دور سے آتے ہیں۔حتی کے غیر مسلم بھی افطاری میں شریک ہوتے ہیں۔افطاری کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔مسجد کے حی علی الفلاح کی جانب جو دروازہ ہے اس کی کشادہ سیڑھیاں اترنے کے بعد سینکڑوں ہوٹلیں ہیں۔جن میں کئی طرح کی کھانے کی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں۔لوگ یہاں سے افطاری کا سامان لیتے ہیں اور مسجد میں دسترخوان بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہاں کھانے کی تو کئی اقسام ہیں ان میں سے جو میں نے دہلی کے دو ڈھائی دنوں میں تناول کیا وہ بتائے دیتا ہوں۔یہاں کا قریشی سیخ کباب بہت مشہور ہے۔اسی روپے کے دو کباب اور رومالی روٹی ہوتی ہے ساتھ ہرے دھنیے کی چٹنی اور مسکا یا چربی گرما گرم ڈال کر دیتے ہیں۔ایسے لذیذ کباب میں نے ممبئی میں کہیں نہیں کھائے۔امُول کے فل فیٹ والے دودھ میں شربتِ محبت نقلی عرب بن کر ہندوستانی بیچتے ہیں۔دودھ میں برف، تربوز اور روح افزا انڈیل دیتے ہیں۔اس مشروب کو کافی پسند کیا جاتا ہے۔مچھلی فرائے تمام ہوٹل پر ملتی ہے۔مرغ مسلّم، نلی نہاری، مٹن قیمہ، ربڑی شاہی ٹکڑا، قیمہ پکوڑے، پنیر پکوڑے اور ان کے علاوہ طرح طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ایک انوکھی چیز شیر مال ہے، جو ایک طرح کی روٹی ہوتی ہے اور اس کے اوپر ہر طرح کے ڈرائے فروٹس چسپا کئے ہوتے ہیں جو ۸۰/ سے لیکر ۲۰۰/ روپے تک ملتی ہے۔

جامع مسجد کے بعد لال قلعہ کا دور سے معائنہ کیا۔ دن کے بجائے رات میں اس کا باہری منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔جامع مسجد سے کئی جگہوں کا سفر کیا جیسے پرانی دہلی، نئی دہلی، سپریم کورٹ، انڈیا گیٹ، آزاد نگر، کشمیری گیٹ اور آخر میں حضرت نظام الدین۔دورانِ سفر میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ دہلی میں سرکار تو عام جنتا پارٹی یعنی کیجریوال کی ہے لیکن تمام جگہ پوسٹر، اشتہار مودی اور اس کے ہمنوا کے ہیں۔حتی کے حج منزل جو دہلی اسٹیشن سے جامع مسجد آتے ہوئے راستے میں واقع ہے۔ وہاں پر پوری منزل پر محیط لمبائی میں مودی کا پوسٹر آویزاں ہے۔تف ہے! حج منزل کے اہلکاروں پر۔

جامع مسجد کے پاس قبر نما ایک چھوٹے سے ہوٹل روم میں میرا قیام تھا۔جس کی قیمت چار سو روپے چوبیس گھنٹہ تھی۔

جامع مسجد سے میں نظام الدین مرکز گیا، راستے میں بنگال سے آئی جماعت کے تین افراد

مل گئے تھے۔انہیں کے ساتھ آٹو میں بیٹھ کر مرکز پہنچا۔عشاء کی نماز حضرت مولانا سعد صاحب کاندھلوی کی اقتداء میں پڑھی۔نوافل کے بعد مولانا کے درسِ حیات الصحابہ کی بھی کچھ دیر سماعت کی۔بعد ازاں مرکز ہی میں سونے کی جگہ تلاش کرنے لگا لیکن مرکز میں جو چار منزلہ ہے اور ہر منزل پر بڑے بڑے ہال ہیں کہیں پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔حتی کے سیڑھیوں اور سیڑھیوں کے اطراف میں بھی لوگ بستر ڈالے پڑے تھے۔پچھلی جانب جو مرکزی مسجد ہے،وہاں بھی ہاؤس فل تھا۔پہلے وہاں ادارۂ دینیات کا آفس بھی واقع تھا۔اب میں نے سونے سے پہلے کھانے کا انتظام کرنا مناسب سمجھا۔مرکزی مسجد کی جانب کھانے کی کئی چیزیں موجود تھیں۔پہلے مرکز کے سامنے ہوٹل تھے،جہاں عمدہ کھانا نایاب تھا۔اب مرکزی مسجد کی جانب عمدہ کھانے کے کئی ہوٹل دستیاب ہیں۔یہاں سے کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ایک ہوٹل میں ۸۰۰/روپے میں روم کرائے پر لیا۔اور چند ٹینشن والے میسیجز پڑھ کر سو گیا۔

جمعہ کی نماز بھی امام صاحب یعنی مولانا سعد صاحب کے پیچھے پڑھی لیکن چونکہ چوتھے منزلہ پر تھا اور امام صاحب مائک استعمال نہیں کرتے ہیں۔اس لیے قرأت کی آواز کان تک نہیں آتی تھی۔صرف موذن صاحب جو تکبیراتِ انتقالی ادا کرتے تھے وہ سنائی دیتی تھیں۔

رات عشاء بعد جموں توی جانے والی ٹرین میں سوار ہوا۔سفر لمبا تھا تو میں نے سوچا اہلیاؤں سے میسیج میں بات کر کے سفر آسان کرتے ہیں اور یہی ٹرک میں نے دہلی سے ممبئی واپسی پر بھی اپنائی لیکن کسی نہ کسی بات پر بات بگڑ گئی۔کبھی تیسری کی طرف سے تو کبھی دوسری کی طرف سے شکایتی پیغام موصل ہونے لگے۔بہرحال فون رکھ کر اس ہریانوی فیملی کو دیکھنے لگا جن کو پنجاب میں کہیں اترنا تھا۔ایک خاتون تھی بچہ اس کی گود میں تھا۔بھائی،شوہر،ماں اور باپ سب ساتھ تھے۔سنا تو تھا کہ ہریانوی خاتون بڑی جبر ہوتی ہے آج بالمشافہ دیکھ بھی لیا۔اگرچہ دودھ پلانے کا طریقہ نہیں آتا تھا لیکن اپنے شوہر اور باپ کو کس طرح قابو میں رکھنا ہے،کس طرح ان سے برتاؤ کرنا ہے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے جموں توی آچکا تھا،یہاں کی سرگزشت میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ابھی فقط مولوی اخلاق کی بیوی اور ان کے والد کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ان کی اہلیہ باتوں سے بڑی تعلیم یافتہ معلوم ہو رہی تھیں۔مردوں و خواتین سے باتیں کرنے میں کافی بے باک

تھیں۔میرے سامنے بھی اپنے شوہر اور بچوں وغیرہ سے بلا جھجک بات کرنا ہوسکتا ہے ان کی پہاڑی پرمپرا ہو۔چھریرے بدن کی پھرتیلی خاتون ہیں۔ مدرسہ کے بہت سے مہمانوں کی مہمانوازی بڑی دل جمعی سے کرتی ہیں اور اپنے شوہر نامدار کو بلا مانگے مشوروں سے نوازتی رہتی ہیں۔گاڑی میں ان کے ساتھ سفر میں وہ برابر اپنے شوہر اور بچوں سے گفتگو کرتی رہتی ہیں۔

مولوی اخلاق تھوڑے بھولے انسان ہیں۔ کسی کام میں لگ کر دوسرا کام بھول جاتے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ کار سے انہوں نے اپنی بیوی کو کسی کام سے اتارا، پھر فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے گاڑی آگے لے گئے۔ بچے پیچھے سے آواز لگا رہے ہیں کہ ''ابو'' ''امی''۔ وہ بیچاری پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئیں تو بچے اپنی امی سے کہنے لگے کہ ابو آپ کو بھول گئے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ یہ پہلی مرتبہ کی بات نہیں ہے پچاس بار ایسا ہو چکا ہے۔

مولوی اخلاق کے والد پہلے فوج میں تھے۔ ان کے دروازے پر بھی لکھا ہوا ہے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل۔ان سے میں نے پوچھا کہ ۳۷۰ ہٹنے کے بعد یہاں پر اس کا کچھ اثر پڑا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ پوری ریاست ہی ختم ہوگئی ہے۔ پہلے کوئی غیر کشمیری کشمیر میں پلاٹ نہیں خرید سکتا تھا، کوئی قانونی دخل اندازی نہیں کرسکتا تھا، یہاں پارلیمینٹ خود مختار تھی۔آج وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

چنانچہ مجھے کسی نے بتایا کہ ممبئی، گجرات، بنگلور کے بہت سے مسلم وغیر مسلم یہاں زمینیں خرید رہے ہیں۔بعض لالچی کشمیری ان کو فروخت بھی کر رہے ہیں۔

بہرحال پندرہ دنوں کا یہ سفر پرسکون رہا سوائے چند پیغاموں اور میسیجز کے۔جس سے طبیعت بوجھل، دل اداس اور سر درد ہو جاتا۔باقی کوئی ٹینشن نہیں تھا، زندگی ایک سفر کا نام ہے۔ خدا کرے ایسا سفر زندگی میں بارہا آئے۔۔۔۔۔لیکن سفر قرار نہ کہ سفر فرار!!

———

مختصر پر لطف سفر

طعام اور زنان دو ایسی چیزیں ہیں جن کی طرف انسان کا میلان قبر تک رہتا ہے، حتی کہ وہ کھانے سے سیراب بھی ہوجائے تو دوسرے کو کھاتا دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اپنوں کو کھلا کر خوش ہوتا ہے اور غیروں کو کھلا کر ثواب کی امید رکھتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اطعام الطعام کو بہترین عمل گردانا گیا ہے بلکہ یہ ایسا عمل ہے جو ہر مذہب اور دھرم بلکہ دھریت میں بھی قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ یہی فضل عمل نکاح کو بھی حاصل ہے، جس طرح اول میں تنوع پسندیدہ ہے، ثانی میں بھی پسندیدہ ہے۔

لیکن یہاں اول ہی کو زیر بحث لانا ہے کیوں کہ یہاں نہ نسواں تھیں نہ نسوانیت اور کسی بھی چیز کا وجود لفظی کوئی کارآمد نہیں ہوتا ہے۔

ذکر طعام کوئی فضول بھی نہیں ہے بلکہ عمل نبی ﷺ سے اس کو تقویت حاصل ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''وَإِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهُ مَعَنَا''یعنی جب ہم کھانے کا تذکرہ کرتے تو حضرت نبی کریم ﷺ بھی ہمارے ساتھ کھانے کا تذکرہ کرتے، لہٰذا میری اس تحریر سے کوئی مجھ سے صوفیت کا لیبل نہیں ہٹا سکتا اور اہم مقصود ذکر سے یہ بھی ہے کہ ہمارے جن احباب نے آخری وقت میں آنے سے معذرت کرلی تھی اب وہ آئندہ ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ معذرت کرنے سے پہلے سوچیں گے۔

ہمارے مفکر طعام مولوی محمد میانور تھے اور وہی سائق بھی تھے، بیمار ہونے کے باوجود اساتذہ کی محبت میں آگئے تھے۔ مولوی یعقوب کی رہبری میں ممبئی ہی سے اچھا خاصا ناشتہ، کباب، سموسہ، اڈلی اور مشروبات ساتھ رکھ لی تھیں جو راستہ کے لطف کو دوبالا کرنے کے لیے تھیں، پورا راستہ کھاتے پیتے بحسن و خوبی تمام ہوا۔

بارہ بجے کے قریب پرشکوہ عمارت ہارون منزل پر قیام ہوا۔ ظہر بعد کسی ڈھابے پر شاندار دعوت ہوئی۔ گرمی کی شدت میں کھانے کا شدت سے انتظار تھا۔ یہ آخری بھوک تھی جو ان دو دنوں میں محسوس ہوئی۔ اس کے بعد واپسی تک وقفے وقفے سے وسعت کے ساتھ دسترخوان بچھتے رہے۔

بہر حال کھانے میں مرغ ملائی لائی گئی۔مرغی نہ بڑی تھی نہ اس کا گوشت روکھا تھا، اس کا گوشت بھی ملائی کی طرح منہ میں گھل رہا تھا، یہ بہت جلد ختم ہوگیا واپس سے انتظار کی شدت، پھر چکن چلی جیسی گریوی لائی گئی اس کے ساتھ گھی میں ڈوبی تندوری روٹی، اس کی بوٹی بھی بہت سافٹ تھی یوں معلوم ہو رہا تھا کہ بغیر ریشے والا کوئی گوشت کھا رہے ہیں۔ اس کے بعد فرائیڈ رائس پر کھانے کا اختتام ہوا۔

عصر بعد ہم ساحل سمندر گئے، وہاں بچوں کے ساتھ ہم بچوں کی طرح نہائے، مفتی طہ فرط مسرت میں خوب چیخے چلائے، پہلے تو محسوس ہوا کہ گھر کی چیخوں کا جواب یہاں چلا کر دے رہے ہیں۔سمندر شفاف تھا اور مٹی اور کچرے سے صاف، یہاں نہا کر یوں احساس ہوا کہ وہ خوشیاں یا وہ بچپنا جو ہم نے کہیں چھوڑ دیا تھا یہاں سے اٹھالیا ہو، اور اپنے ہموم وغموم کو، فکروں اور تناؤ کو، عرب مہا ساگر میں کہیں بہا دیا ہو، یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی بس اس چیز کی کمی تھی جس کا ذکر اوپر دوسرے نمبر پر کیا گیا(کاش وہ ہوتیں تو دوسرے غموں کے ساتھ ان کو بھی بہا دیا ہوتا) لیکن ہمیں نہ ثانی الذکر کی کمی محسوس ہوئی اور نہ کسی ثانیہ کی کیوں کہ سمندر کی موجوں کی ہلکی ہلکی تھپکیاں کسی محبوبہ کی باہوں کی مساس سے کم نہیں تھیں اور ساحل سمندر پر پہنچتا ہوا لہروں کا شور کسی معشوقہ کی گیت سے کم نہیں تھا۔ بحر عرب کی غوطہ زنی، ممسوسہ کے پیار کی گہرائی میں اتر جانے سے کم نہیں تھا اور سمندر میں دخول وخروج سے زیادہ فرحت بخش اور نشاط آور تھا حتی کی مولوی عامر جیسے صوفی انسان پانی سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔

باقی کھانوں کی تصاویر سے احباب لطف اندوز ہو ہی چکے ہیں لیکن سرسری ذکر بھی ثواب سے خالی نہیں ہوگا، ویسے اے سی اور مجھے آنے والے میسیج کے علاوہ کوئی چیز مایوس کن نہیں تھی۔ تمام تر سفر خوش کن تھا بالخصوص رات کی آئسکریم نے گرمی کی شکایت کم کرنے کا کام کیا۔ رات میں چکن تکہ اور دال چاول کھا کر جلد سونے لیٹ گئے، کسی کو جلد کسی کو رات گئے نیند آئی، ناشتہ میں بھرجی پاؤ سے نمٹ کر احباب دوبارہ لہروں سے دو دو ہاتھ کرنے چلے گئے اس الوداعی ملاقات کے بعد احباب پر تکان کے کم، غم فراق کے آثار زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔

مڑ مڑ کر دریاؤں کی موجوں کو دیکھنے کے بعد ہمارا قافلہ طعام پز کے گھر فروکش ہوگیا اور یہاں مچھلی فرائے، مچھلی بریانی، مچھلی کڑھائی سے لمحوں بعد لطف اندوز ہونے لگا، سب اپنوں

سے بے گانے ہو کر کانٹوں میں مشغول تھے، یوں لگ رہا تھا دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زندہ مچھلی نوچ رہے ہوں۔مولوی عبداللہ ڈوکڑیا بار بار نوش کرنے کی فہمائش بھی کر رہے تھے۔ مچھلی کے ساتھ پاپڑ، چاول کی روٹی اور چپاتی تھی۔ اختتامیہ میں رتنا گیری ہاپوس آم تھا، اس پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد آم کا جوس طلب کیا گیا لیکن وہ مینیو میں نہیں تھا اس لیے گرین ٹی پلا کر چلتا کر دیا گیا۔

مولانا عثمان صاحب سے کافی انسیت ہوگئی تھی تو ان کی خدمت میں ایک مخصوص شہد پیش کیا گیا، لگے ہاتھوں مفتی احمد صاحب بھی فیض یاب ہوئے۔

یقیناً قرآن ہمارا رہبر ہے وہی سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن گوگل میپ سے راہ یابی ممنوع بھی نہیں ہے۔ ہمارے سائق محترم جناب مکرم میانور صاحب نے واپسی میں گوگل ہی کا سہارا لیا۔ اس گوگل نے آہستہ آہستہ ہمیں کبھی پہاڑ پر پہنچایا، کبھی دامن کوہ میں، کبھی بل کھاتی دریا کے کنارے، تو کبھی وادی میں بسے خوبصورت شہر روحہ میں۔

بہر حال گوگل کی اس گڑبڑی رہنمائی نے ہمیں کافی حسین، دلفریب، خوش نما مناظر سے ملایا، کبھی بل کھاتی سڑکوں سے پیٹ کا پانی ہلنے لگتا تو کبھی ہموار سڑک (جس کے دونوں جانب درخت سایہ فگن تھے) دماغ کو تازگی بخشتی۔عصر بعد کا یہ سفر ہلکی پھلکی مزاح اور دل لگی کے ساتھ پر لطف گزر رہا تھا لیکن بہر حال اس کو ختم ہونا تھا اور وہ ۹:۳۰ بجے فائن ٹچ پر تمام ہوگیا۔ زندگی بھی ایک سفر ہے۔ اللہ تعالیٰ سفر زندگانی کو بھی اس سفر کی طرح آسان بنا دے اور اس سفر کے ہم راہوں کی طرح سفر زیست کے ہم راہ بنا دے۔ (آمین)

و صلی اللہ علی النبی الامی۔
جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

———

ڈابھیل کا سفر اور دعوت طعام

برسوں بعد قاری سہیل ویسماوی کی تحریک اور قاری ساجد صاحب کے لبیک کہنے سے چند یاروں کا اجتماع ہوا۔ قاری ساجد کے فرزند ارجمند کے حافظ قرآن ہونے کی مناسبت سے ایک شام مع دعوت طعام ہم اکٹھا ہوئے۔

قاری ساجد ، قاری زکریا، قاری حذیفہ، قاری سہیل ، مولوی محمد علی ، مفتی عمران

دعوت بہت پر تکلف تھی اور تعجب و خوشی کی بات کہ یہ سب پکوان خاتون خانہ نے بڑے اخلاص ، محبت ، لگن اور احتساب سے تیار کیے تھے، ان ہی پکوان کا ذکر مقصود ہے ۔

مغرب کے کچھ دیر بعد دسترخوان طرح طرح کے پکوان سے سج دھج چکا تھا۔

ابتدائیہ میں:

۱) خالص گوشت کے کباب جو چپلی افغانی کباب کے مشابہ تھے اور لذت میں اپنی مثال آپ تھے، ان پر لیموں کی بارش کر کے دوستوں نے اس کو اپنے ہونٹوں کو لگایا۔

۲) چکن رول جن میں چکن ، ماؤنیز اور مکئی کے دانے ایک حساب سے بھرے ہوئے تھے۔ یاروں نے اس پر بھی دست درازی کی۔

۳) مرغ کی ٹانگیں تھیں ، جن پر عمدہ لذیذ مسالہ لگا کر کچھ اس طرح تلا گیا تھا کہ مسالے کا ٹیسٹ لیگ پیس کی ہر ہر جز میں سرایت کر کے اس کا روکھا پن ختم کر چکا تھا۔ ساتھیوں نے اس پر بھی رحم نہیں کیا اور کنواری مرغی کی ٹانگ اٹھا کر اس کا بھی حق ادا کیا۔

۴) ابتدائی اضافی میں آ کولہ کا مٹن قورمہ منتظر تھا دیکھتے ہی دیکھتے باؤل کا قورمہ یاروں کی تشتری میں تھا، گیہوں کی گرم روٹیوں سے حلوے جیسا گوشت کا جوڑ کافی خوب تھا سب ساتھیوں کو اپنی بیویوں کے ہاتھ یکھے لگ رہے تھے۔ گوشت اور قورمہ کا ذائقہ ایسا کہ اس کو بچہ بھی کھا سکتا ہے، بڑا بھی اور بوڑھا بھی، لہٰذا احباب کچھ لحاظ کیے بغیر قورمے کو ہونٹوں سے بوسہ دینے لگے۔

۵) ریڈ چلی کا چکن قورمہ بھی تھا افسوس کہ وہ میں چکھ نہ سکا لیکن حقوق اس کے بھی پورے ادا ہوئے۔

۶) ابھی پیٹ میں مختلف پکوان کا گھمسان جاری تھا کہ قاری ساجد اعلان کرتے گرما گرم رئیس الطعام (پاٹیہ) لے آئے ، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ قاری سہیل اپنے ساتھ لائے تھے۔ لذت میں اس نے محمد کے پاٹیے کو پیچھے چھوڑ دیا ، یاران باوفا ٹاٹیا اٹھانے کی نیت سے پاٹیا رچ بس کر کھانے لگے۔

۷) کھاتے کھاتے پیٹ نے جواب دے دیا تھا لیکن پردے کے پیچھے سے آمد در آمد ابھی بھی لگی ہوئی تھی۔ انتظار کیے بغیر گرم گرم وتج بریانی آگئی، جن لوگوں کا چاول کے بغیر پیٹ نہیں بھرتا ہے ان کی آنتوں کو بھی سکون بہم مل گیا۔ وتج بریانی کھا کر مدرسہ کی جمعہ رات یاد آگئی جب میں قاری ساجد کے ہاتھ کا مسالے دار چاول کھاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں میاں بیوی کے ہاتھ میں لذت رکھی ہے، ٹیسٹ ایسا کہ نہ کھانے والوں نے بھی دو دوبار لے کر کھایا۔

۸) میٹھا ایسا کہ کوئی نئی ایجاد تھی۔ اس کے نام سے تو میں واقف نہیں ہوا، غالباوہ میٹھی بوندی کا انوکھے طرز پر بنا ہوا حلوہ تھا۔ دوستوں نے زیادہ لینے کے بہانے تعریف تعریف کر کر کے کھایا۔

۹) یوں لگا کہ دعوت کا اتمام جس کا اہتمام بڑی مشقت سے کیا تھا ہوگیا لیکن پردہ تھا یا غیبی خزانہ ناریل اور ناریل پانی سے بنی پڈنگ وہاں سے دسترخوان پر آدھمکی۔ یہ کھانے کا پہلا تجربہ تھا اور واقعتا کافی خوب تھا، دو منٹ بعد دونوں کلاں باؤل میں صرف کھنکھناتے چمچ تھے۔

۱۰) انتہائیہ میں سونف ، تل اور پان مسالے سے لطف اندوز ہوئے۔ آئسکریم کی کمی محسوس ہو رہی تھی اس کا حق ڈابھیل گاؤں میں موجود ایک دوکان کو دیا اور تین فلیور کی آئسکریم کلفی کو بھی کھانوں کے قبرستان میں جگادی۔

حدیث شریف میں آتا ہے "بَرَكَةُ الطَّعَامِ الوُضُوءُ قَبْلَهُ وَالوُضُوءُ بَعْدَهُ" یہ وضو قاری ساجد نے اپنے ہاتھوں سے دسترخوان ہی پر کرایا۔

رات قاری ساجد کے یہاں گزاری سحری کے وقت ہی اندرون خانہ ناشتہ کا تکلف کیا گیا اور فجر بعد واپس دسترخوان شاہی لقمہ ، وتج بریانی اور گرم چائے سے سجادیا گیا۔ شاہی لقمہ روٹی،

گھی، ڈرائے فروٹ اور دودھ سے تیار کردہ ایک ملیدہ ہے۔ کھانے میں لذت بخش، پچنے میں زود ہضم اور افادہ میں قوت بخش ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قاری صاحب کے جان و مال میں ایمان و اعمال میں برکت عطا فرمائے۔ ان کی خاتون خانہ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور بچہ کو جو حافظ ہوئے ہیں امد اور ان کے علاوہ دوسرے بچوں کو عامل قرآن، حافظ قرآن، خادم قرآن بنائے اور دنیا و آخرت کی خیر مرحمت فرمائے۔

اس دعوت کے بعد بندے نے اپنا ایک مزاحیہ کلام تعدد ازدواج پر پیش کیا جس کو ساتھیوں نے لطف لیتے ہوئے سماعت کیا اور داد تحسین سے بھی نوازا۔

مولانا! بات میری مانیے اور مشورہ میرا قبول کیجیے
دیکھیے ایجاب وہاں سے ہوگیا ہے بس آپ نکاح قبول کیجیے۔
زندگی کی اک نئی شروعات کر کے دیکھو
بھولا ہوا جوانی کا سبق یاد کر کے دیکھو
وہ مستی بھری نگاہیں، وہ قربت کے بعد ہچکچاہٹ،
وہ ہاتھ لگانے پر شرمانا، وہ بات بات پر مسکرانا
ابتداء نہ کرنے پر ان کا اداؤں سے اشارہ دینا
بے چینی بے صبری اور بے قراری کا پھر مشاہدہ کرنا
کیا دل نہیں کرتا مولانا کیا واقعۃ ان سب کا دل نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔۔
مخاطب ہے میرے دوست
بواسطۂ یارانی
شوق بڑھاؤ ذرا ہمت کو
دو جولانی
داستان حسن سن کر جذبات
میں لاؤ طغیانی
کب تک صوفی! صوفی رہو گے؟
کرلو ذرا شیطانی

طبیعت کو آزاد چھوڑ
کر لے ذرا وہ من مانی
عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے یارو
کہ ایک میں کہاں ہے شادمانی
ایک سے آگے بڑھ تو سہی
لگے گی تجھے ذرا گرانی
رفتہ رفتہ دم بدم
ہو جائے گی یہی ارزانی

تعدد ہے وہاں بھی، جہاں
ہے ہمیشہ کی زندگانی
اٹھ کھڑا ہو ارادہ میں نام لکھا
یوں برباد نہ کر جوانی
یوں ہی تھوڑی حکم ہے
فرمان رحمانی
تعدد ہی میں ہے
لطف حیوانی

کیا یہ بات تجھے اچھی نہیں لگتی کہ:

ایک تیری باہوں میں ہو
دوسری یادوں میں دیوانی
ایک پلائے پانی دوسری
ہو پانی پانی

کھا کر معجون چورن
دکھاؤ اپنی مردانی
چھا جاؤ تم کسی پر
مثل سلائی سرمہ دانی

مشودہ دیتا ہوں یہ مرے احباب کو
میں ہی پریشان رہوں کہاں انصاف ہے
اک بات کہہ دو آپ کو جو صاف صاف ہے
مصیبت تو ضرور ہے پر لذت بے حساب ہے
آپ بھی کریے میرا ساتھ آپ کے ساتھ ہے
آگ لگے مرے ہی چلمن میں کہاں انصاف ہے

اک ہی بستر ہو پراگندہ اچھا نہیں یہ دھندہ
تعدد چاہیے بستروں میں گرچہ لوگ کہیں گندہ
ایک کر کے بھی کون سکون سے ہے بندہ
چار کر کے ہی دم لے اے دوست
اگرچہ ہونا پڑے تجھے شرمندہ

———————

ایک سفر میں اساتذۂ جامعہ سے ملاقات

چند اساتذہ سے مختصر ملاقات: ہمارے جامعہ کے تمام ہی اساتذہ منارۂ نور ہیں، ان کے اقوال اور احوال انوار و برکات سے معمور ہیں۔ اساتذہ سے ملاقات کے وقت یہ احساس مجھے برابر رہتا ہے کہ کہیں طویل ملاقات سے استاذ کو کوفت نہ ہو، اس لیے مختصر ملاقات کرنا پسند کرتا ہوں، اس کے علاوہ کوئی کارگزاری بندے کے پاس ہوتی نہیں ہے کہ کارنامے گنائے جائیں۔

امتحان ہال کے باہر علم و استغناء میں نمونہ اسلاف حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم سے ملاقات ہوئی، میں جھجک رہا تھا حضرت مولانا نے از خود سلام کر کے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور خیریت دریافت کی۔ (ملاقات ختم)

کتب خانہ کے باہر بلیاوی وقت مولانا الیاس صاحب لوہاروی دامت برکاتہم سے ملاقات ہوئی، حضرت کا قلت کلام اور اجتناب عن اختلام مع الانام مشہور ہے اور تقریبا چار پانچ سال بعد حضرت سے میری ملاقات ہوئی آپ نے دیکھتے ہی فرمایا مولوی یحییٰ خیریت سے ہو کس طرح آنا ہوا؟ کہا کہ ملت کے طلباء کا دورہ حدیث میں داخلہ کرانے کے لیے۔ (ملاقات ختم)

کتب خانہ میں ضاحک متبسم حضرت مولانا مفتی عبید اللہ صاحب سورتی دامت برکاتہم سے ملاقات ہوئی ان سے بھی ملاقات تین چار سال قبل ہوئی تھی، ملاقات کرتے ہی فرمایا یحیی زندہ باد خیریت سے ہیں؟ معمولی گفتگو کے بعد دیگر ملاقاتی بھی تشریف لے آئے تھے۔

علم و تحقیق میں اعلام فرقہ باطلہ کے لیے تلوار بے نیام مفتی ابو بکر صاحب پٹنی دامت برکاتہم سے مختصر ملاقات ان کے کتب خانہ ادارہ صدیق میں ہوئی۔

فن قراءت کے مرجع حضرت قاری ومقری رضوان صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات جامعہ کی مسجد کے باہر ہوئی آپ اپنے فرزند ارجمند کے ساتھ نو وارد طلباء کا داخلہ امتحان لے کر تھک چکے تھے۔

صاحب مکارم الاخلاق، تواضع اور سادگی کے بحر بے کراں صدر مفتی جامعہ ڈابھیل مفتی عباس صاحب بسم اللہ سے ان کے دار الافتاء میں ملاقات ہوئی، ''در جواب آں غزل'' کے سلسلے میں چند ضروری بات ہوئی پھر بندے نے جانے کی اجازت طلب کی تو حضرت نے فرمایا: آپ

کے گھریلو حالات کا کیا ہوا؟ اور پھر خوب دعائیں دیں۔ (حالاں کہ میں نے آپ کو دو سال قبل اپنے حالات بتائے تھے)

دار القضاء میں جامعہ کے قاضی مفتی فاضل قاری محدث مفسر محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی دامت برکاتہم سے مختصر ملاقات ہوئی، آپ کسی سے ہم کلام تھے اور نصیحت فرمارہے تھے کہ آج کل لوگ اچھا مہنگا موبائل استعمال کرنے میں عزت سمجھتے ہیں حالاں کہ جس کو علم دیا گیا اس علم کے نزدیک کیا حیثیت اس موبائل کی، پوری دنیا کے موبائل ایک طرف اور ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا ایک طرف۔ میں کبھی خاطر میں نہیں لاتا ہوں ان لوگوں کے اس عمل کو جو اچھا موبائل استعمال کرنے کو عزت گردانتے ہیں، دوران گفتگو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں طلباء کو کہتا ہوں کہ لوگوں میں قرآن وحدیث ہی کی بات کرو اور اسی سے ان کو جوڑو۔ دوسری ایران توران کی باتیں چھوڑو۔ موبائل کے بہت سے نقصانات ہیں لیکن اس کے دو نقصان سب سے بڑے ہیں ایک بے حیائی دوسرا شکوک وشبہات، موبائل سے انسان کو قطعی سے قطعی باتوں میں شبہ ہونے لگتا ہے۔

———